


فسانہ



سفر میں
بڑا ہی
مزا آئیگا
چنیدہ طاقت سے بھرپور
اجزا سے بنائی ہوئی
جے۔ بی۔ منگھارام کی
مٹھائیاں اور بسکٹ آپکے
سفر میں بے حد دلکشی اور مزا پیدا کریں گے
جے۔ بی۔ منگھارام کے
بسکٹ
لگ بھگ سبھی
ریسٹورنٹ
اور کنٹین بیچتے ہیں
جے۔ بی۔
منگھارام اینڈ کمپنی
گوالیار، حیدرآباد
J B MANGHARAM'S
Salto
Biscuits

شرح چندہ
سالانہ دس روپیہ
عام شمارہ ایک روپیہ
خاص شمارہ ڈیڑھ روپیہ

دوسرا سال
شب کی

رہنما
بلونت سنگھ

مدیر
مسعود احمد

خطاط
سید احمد حسین

فسانہ میں شائع ہونے والے تمام ادبی یا نیم ادبی مواد میں نام، مقام، واقعات اور ادارے قطعی فرضی ہوتے ہیں اور حقیقی افراد، مقامات، واقعات، یا اداروں سے ان کی کوئی مطابقت محض اتفاقیہ ہے جس کے لئے ایڈیٹر، پبلشر یا مصنف پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی —

فسانہ

دفتر فسانہ
۲۱۶ - دائرہ شاہ اجمل - الہ آباد ۳

ناظم :- عبد القدوس رومی
طابع و ناشر :- مسعود احمد
مطبوعہ :- اسرار کریمی پریس الہ آباد
ٹائیٹل :- بہار گو پریس الہ آباد



صنم کدہ کی

اوّلین پیشکش

بہو بیگم

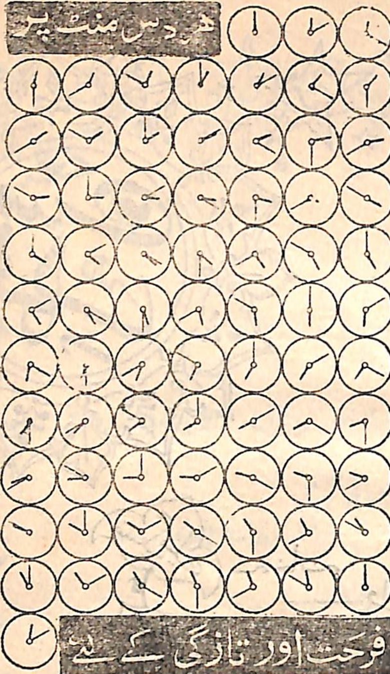
سرزمیں اودھ کی حویلیوں کی
داستان جن کے دروازوں
پر کبھی ہاتھی جھولتے تھے اور
نوبت بجا کرتی تھی ---- لیکن
آج گردشِ زمانہ کے ہاتھوں
اُن کے در و دیوار مسمار ہو چکے
ہیں اور عظیم کھنڈروں سے
حسرت برس رہی ہے۔

ستارے

مینا کماری
اشوک کمار
پردیپ کمار

- ہدایت :- ایم صادق
- نغمے :- ساحر
- موسیقی :- روشن
- کہانی :- جاں نثار اختر
- عکاسی :- ثریان ایرانی

ایسٹ مین کلر میں



چیتا فائٹ



بیڑی پیجئے

حاجی لعل محمد بیڑی ورکس میرگنج الہ آباد



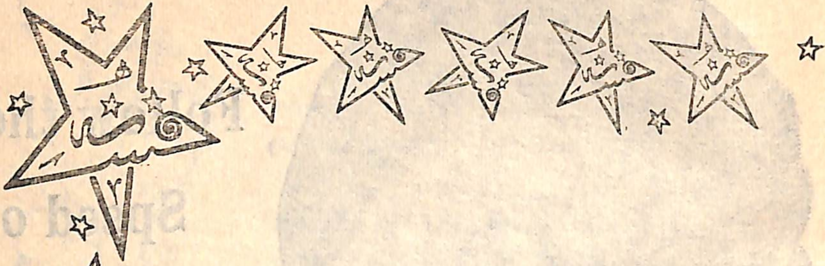
سنگ میل

تامل کہانی

اردو کہانی

تلخیص کتب


















جرمن کہانی
کھیلوں کی کہانی
شکاریات
ہندی کہانی
سیر و سیاحت





Follow the Speed of Proggress

for Beauty
and charm use



fghan Snow
Beauty Aids
. Patanwala, Bombay - 77 (INDIA)



خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ناظرین فسانہ نے خاص نمبر کو کافی پسند فرمایا اور اسطرح ہم کو اپنی کاوشوں کا بدلہ صحیح معنوں میں مل گیا۔

اب فسانہ کا تازہ شمارہ پیش خدمت ہے۔ ارباب فسانہ کو اس اطلاع سے یقیناً مسرت ہوگی کہ ہم نے اس بار سے فسانہ کی ضخامت میں اضافہ کر دیا ہے جس کی بنا پر مجبوراً ہمیں قیمت میں بھی معمولی سا اضافہ کرنا پڑ گیا۔

فسانہ کے صفحات میں محترمہ شمع ظفر مہدی صاجبہ کا نام اس بار نیا نظر آئیگا۔ لیکن ان کی کہانی "سب کہاں کچھ لالہ و گل میں" کافی عمدہ حسین اور انداز تحریر نہایت پختہ و فنکارانہ ہے۔ امید کہ ناظرین کو یہ کہانی ضرور پسند آئے گی۔

ایس۔ ایم حیات بادشاہ کی کہانی "آج اور کل" قابل مطالعہ ہے جرمن کہانی "ھمراز" نہایت لطیف اور حسین کہانی ہے۔ "بھوک" دنیا کے عظیم ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ فسانہ اس کو پیش کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتا ہے۔ محترمہ واجدہ تبسم کے انداز تحریر سے ناظرین فسانہ خود ہی کافی مانوس ہیں۔ ان کی کہانی "تہ خانہ" بڑی ہی پیاری ہے جو خصوصی مطالعہ کی مستحق ہے۔ "اولمپک کھیلوں کی کہانی" کا ایک نیا سلسلہ اس شمارہ سے شروع کیا جا رہا ہے اُمید کہ ناظرین اس کو بھی پسندیدگی نظر سے دیکھیں گے۔

مُدیر

ایک بات یاد رکھیے کہ

نورانی تیل رجسٹرڈ

دورِ حاضر کی بہترین ایجاد ہے
جس کی ضرورت ہر وقت پڑتی ہے۔



درد۔ زخم۔ چوٹ کٹنے جلنے اور
طاقت کی مشہور دوا ہے

اِنڈین کیمیکل کمپنی مئوناتھ بھنجن یو۔پی



واجدہ تبسم

گورے گورے ہاتھ بڑی پھرتی سے چل رہے تھے۔
بڑے سے تھال میں گیہوں کا آٹا بھگوئے ذکیہ بی گنی لگا رہی تھیں۔ ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ان کا ہلکا پھلکا بدن جھکولے کھا رہا تھا۔ کھڑے گلے کے کرتے میں سے گلابیاں امڈی پڑ رہی تھیں۔ راشد میاں کو شرارت سوجھی، ایک کنکر اٹھا کر پھینکا جو سیدھا ان کے گلے میں سے ہوتا ہوا کسی نشیب میں جا بیٹھا۔

"اے واہ، ذرا سی لاج بھی نہیں آتی ــ!"

میاں اشارے سے بولے: "لاج کیسی ــ؟"

"اِدھر اماں جان بیٹھی ہیں، نظر نہیں آئیں کیا ــ؟" انہوں نے اشارے میں جواب دیا

اب کے راشد میاں زور سے بولے، ہنسی منہ پر بکھری ہوئی:۔

"کیوں جی اگر ہمیں ...."

ابھی ان کی بات منہ میں ہی تھی کہ پچھواڑے کے دروازے سے دھڑ دھڑ کرتے تینوں بچّے داخل ہوئے۔ خوشی سے ان کے منہ تمتما رہے تھے۔ منّا وہیں سے چلّا کر بولا:۔

"اجی اماں جی! اجی ابا جی! بلّی نے بچّے دیئے ہیں ــ" شانو نے آواز میں آواز ملائی:۔

"ہاں ابّا ہم نے خود دیکھے ہیں۔ بہت خوبصورت ہیں۔"

بے بی بھلا کسی سے پیچھے کیوں رہتی:۔ "ہاں ابّا چھب کے چھب گلابی گلابی ناک کے ہیں"

"سچ؟"، راشد میاں بھی بچوں میں بچہ بن گئے۔

"ہاں، ہاں"۔ تینوں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنا شروع کیا۔

"آپ خود چل کر دیکھئے ابّا۔ اتنے پیارے ہیں۔ ہم نے دور ہی سے دیکھا ہے، ورنہ بلّی تو نوچ ڈالے گی۔

راشد میاں کے چہرے پر بھی بچوں کی سی خوشی کھیل رہی تھی۔

"اچھا اچھا چلتے ہیں بھئی؟ مگر جو بلّی مار بیٹھے ——؟"، بچوں کو خوش کرنے کے لئے خواہ مخواہ کی بزدلی دکھا رہے تھے۔

"وہ نہیں مارے گی ابّا۔ ہم کوئی چھیڑتے تھوڑا ہی ہیں۔"

"ہم تو ایک والا لیں گے۔ وہ جو پیلا پیلا ہے۔" شانو نے سب سے پہلے قبضہ جما لیا۔

"اور ہم وہ کالے دھبّوں والا" ہاں۔ منّے نے بھی حق جتا دیا۔

"اور پھر ہم کیا لیں گے؟"

"بلّی جو تمہاری ہے۔" راشد میاں نے فیصلہ کرنا چاہا۔

"ہش"۔ پھر وہ غصّے سے بولی۔ "اتنی بڑی بلّی ہم نہیں لیتے۔"

آپس میں تو تو میں میں ہونے لگی۔ راشد میاں ہنس کر بولے:۔

"ارے بھئی ابھی سے تو نہ لڑو۔ ابھی انھیں ذرا بڑے تو ہو لینے دو۔"

ہنستے بولتے سب کے سب دروازے سے نکل گئے۔

ذکیہ بی کے ہاتھوں میں اب تک آٹا اُلجھا ہوا تھا۔

"ہونہہ! کیسے مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کم بخت بلّی کو بھی اسی وقت بچے جننا رہ گیا تھا۔ اور یہ بھی کیسے ہیں۔ کہ بچوں میں بچہ بن جھٹ اُٹھ کر چل دیئے"، ذکیہ بی کا جی جل کر رہ گیا۔

ساس نے اُدھر سے برچھی چھوئی۔ "اے میں کہوں اب روٹی پکے گی یا یوں ہی آٹا ملتی رہو گی۔ روٹی کی بجائے سویاں اتارنے کا تو ارادہ نہیں ہے؟"

ذکیہ بی نے تلملا کر ساس کو دیکھا : " کبھی آپ لوگ بھوکے رہے ہوں تو گئے نا۔ آپ کو تو وقت پر کھانا مل جائے گا۔"

میاں گودام سے لوٹے تو بچے آگے پیچھے جھول رہے تھے۔ بے بی مارے اتراہٹ کے کندھے پر چڑھ بیٹھی تھی اور ہنس ہنس کر باپ کے ساتھ باتیں ہو رہی تھیں :۔

" اور اباجی نے اسے پکارا تو ہلی تک نہیں۔ پہلے تو موتی بولتے ہی بھاگی آتی تھی۔"

" اور ہاں ابا، شانو بولا، " آپ نے پچ پچ بھی کیا مگر وہ تو ویسی ہی بیٹھی رہی، جیسے اللہ جانے کون بلاتا ہو۔ کتیا بری ہے سالی! "

" ارے ارے! یوں گالیاں نہیں دیا کرتے ننھے بچے۔"

باپ نے پچکار کر کہا۔

" تو پھر آئی کیوں نہیں ؟ "

" بھئی اب وہ ماں بن گئی ہے نا۔ اب اسے ہم سے زیادہ اپنے بچوں کا خیال ہوگا۔ اب وہ کیا ہماری بات سُننے گی بھلا۔ ؟ "

میاں نے تو بچوں سے سرراہ یہ بات کہہ دی، مگر یہ تیر سیدھا ذکیہ بی کے دل میں جا کر اٹک گیا۔ پار نکل جاتا تو اتنی کلپ نہ ہوتی، مگر وہ تو وہیں چھدا رہ گیا۔ دھوئیں کے بہانے اُنھوں نے آنکھوں میں بھرے آنسوؤں کو پونچھا تو ساس نے دیکھ لیا۔

" وہ ئی اپنی کوکھ تو بھرتی نہیں۔ موئے ناصل بلّی کتوں کا بھی حسد نہ چھوٹا۔"

بہو نے تڑپ کر ساس کو دیکھا، مگر وہ اپنی کرتی کی تُرپائی کرنے میں مشغول ہو گئیں تھیں۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی سب کے سب پھر گودام کی طرف بھاگے۔ اور تو اور اب کے راشد میاں نے ذکیہ بی کو بھی گھسیٹ لیا۔

" ذرا دیکھنا تو کتنے پیارے بلونگڑے ہیں۔"

ادھر سے اماں چلائیں : " وہ ئی کیا کام کے موئے! اُٹھا پھینکو۔"

" ارے واہ! اماں بی یہ خوب سُنائی آپ نے " وہ ہنسنے لگے، بھلا اتے اتے سے ذرا ذرا سے، بلونگڑے مر نہ جائیں گے ؟ "

" اے! تو کیا گلے میں باندھ کر لٹکاؤ گے ؟ ابھی چار دن کو بڑے ہوں گے تو جگہ جگہ گو موت

کرتے پھریں گے۔ خواہ مخواہ گندگی ہو گی۔"

منا جھٹ بول اٹھا: "واہ بلی گندگی کہاں کرتی ہے؟ بے چاری پہلے تو گڑھا کھودتی ہے اور پھر اس میں......"

دادی نے پوتے کی بات کاٹ دی: "اے بیٹا! تو پھر بستروں میں سلاؤ، ہمارا کیا جاتا ہے؟"

"یہ اماں تو بس سدا یوں ہی کھسی پھرتی ہیں، چلو ذکا۔" بچے تو بچے تھے، میاں بلونگڑوں کو دیکھ کر یوں اچھل رہے تھے، جیسے سب سے چھوٹے بچے یہی ہوں۔

بلونگڑے چپ چپ دودھ پی رہے تھے۔ بند آنکھوں سے ٹٹول ٹٹول کر ماں کی گرم گود میں گھسے جا رہے تھے۔ بلی یوں مطمئن تھی جیسے اب دنیا کی کسی چیز کی حسرت باقی نہ رہ گئی ہو۔

"ارے بلی کے لئے دودھ لائیں ہم؟ بھوکی ہو گی۔" اور کسی کے جواب کا انتظار کئے بغیر منا اندر دوڑ گیا۔ طشتری میں دودھ لے آیا اور بلی کے سامنے آہستگی سے رکھ کر بولا:۔

"لے پوسی پوسی پوسی، لے پی لے۔"

بلی نے بیچ بیچ سن کر ایک لمحے کو آنکھیں کھولیں اور دوسرے ہی لمحے پھر بند کر لیں۔

شاید گرم چائے پر دل چاہ رہا ہوگا اس کا۔" اب کے ننھا نومیاں دوڑ گئے چینی کی طشتری میں چائے لا کر اس کے سامنے رکھی اور بڑے پیار سے پچکار کر بولے:۔

"لے موتی، یہ چائے پی لے!"

موتی نے چمچاتی آنکھیں کھولیں اور پھر بند کر لیں۔

"ہش"۔ وہ تو پراٹھا کھائے گی۔" بے بی اندر دوڑ گئی اور مٹھی میں نرم نرم پراٹھا دبائے بھاگی آئی اور بالکل اس کی ناک میں پراٹھا گھسیڑ دیا۔

پوسی نے حد درجہ ناگواری سے بے بی کو دیکھا۔ (کوئی طریقہ ہے کھلانے کا۔؟)

بچوں پر ذرا مایوسی چھا گئی۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں کھاتی جی ابا۔"

ابا نے ہنستے ہوئے جواب دیا:۔ "وہ ماں بن کر ہر چیز سے بے نیاز ہو گئی ہے بیٹے۔ اولاد کی محبت ہی ایسی ہوتی ہے۔" بلی نے آنکھ کھول کر سب کو دیکھا، اپنی جگہ سے ذرا ہلی اور بچوں کو اپنے نیچے کر لیا۔ پہلے بلونگڑے کی ذرا سی کمر نظر آ رہی تھی، پوسی بڑی محبت سے اس کی

گھر گو اپنی زبان سے چاٹنے لگی۔ بچّے بد دل ہو گئے۔ پھر سے وہی سوال دُہرانے لگے:

"یہ کچھ کھاتی کیوں نہیں ابّا؟"

"بھوک نہ لگی ہوگی۔" راشد میاں کو خود کوئی معقول جواب نہ سوجھ رہا تھا۔

"ارے واہ! بھوک کیسے نہ لگی ہوگی؟ روز تو جب پوسی پوسی کرکے بلاتے تو بھاگی چلی آتی تھی۔ آج کیا ہوگیا؟ روز تو جب تب دسترخوان پر دھتکاری جاتی تھی اور آج تو کھانے کو سونگھتی بھی نہیں۔"

"ارے اسے گوشت کھلانا چاہیئے۔" منا پھر دوڑا اور ہاتھ میں کچے گوشت کا ایک بڑا سا پارچہ اٹھائے آیا۔

"اب تو کھائے گی سالی!" اس نے جوش میں آکر کہا۔

"پھر وہی گالی!" راشد میاں کبھی تربیت سے غافل نہ رہتے، مگر منے نے اپنی گرم جوشی میں ان کی تربیت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ اور عین بلی کی بند آنکھوں کے سامنے ٹکوا یوں یوں لٹکایا کہ ناک سے چھونے لگا۔

بلی نے ہلکی سی کسمساہٹ کی، اپنی جگہ سے اُٹھی اور دوسری کروٹ پر بیٹھ گئی۔ دونوں بلونگڑے دوسری طرف سے دودھ ڈھونڈنے لگے۔

"آج تو وہ کچھ نہ کھائے گی۔" راشد میاں ہنس کر بولے:-

"اب اسے بچوں کے سامنے کوئی چیز نہیں بھاتی۔"

ذکیہ بی کو اپنا دِل پہلو میں کٹتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو انہوں نے بڑی مشکل سے ضبط کیا اور بغیر منہ سے ایک لفظ نکالے گودام سے نکل گئیں۔

گھر کی ہنستی بولتی فضا میں جیسے رکاوٹ آگئی، مگر صرف ذکیہ بی کی حد تک۔ دل اندر ہی اندر جیسے کٹا جاتا اور گھر میں تو جب دیکھو تب پوسی اور بلونگڑے موضوع بنے ہوئے ہیں۔ میاں باہر سے آتے تو بچے ہاتھ پکڑ کر سیدھے گودام میں دوڑ جاتے۔ بچے اسکول سے لوٹتے تو بستے بغل میں لٹکے ہی ہوتے اور بلی کا طواف شروع ہوجاتا۔ ذکیہ بی کے دل میں جیسے گرہ پڑ گئی۔

"بچہ بھی دنیا میں کیا نعمت ہے۔ چاہے انسان کا ہو۔ جانور کا ہو، سب اسی کو گھیرے

رہتے ہیں۔" اپنی خالی کوکھ کا خیال آتا تو اللہ میاں پر غصہ آنے لگتا۔

"محلے میں جس کو دیکھو کمر پر کالا پیلا بچہ چڑھائے پھرتی ہے۔ گھر بھرے پڑے ہیں اور کھانے کو دانا دنکا تک نہیں۔ خود میاں کو تین تین ہیں۔ میری بھی گود بھر دیتا تو کیا جاتا خدا کا؟"

راشد میاں بڑے دل والے، بڑی محبت والے میاں تھے۔ ذکیہ بی کی خالی گود پر انھیں کبھی اعتراض نہ ہوا۔ ہوتا کیوں؟ اللہ نے انھیں تو آل اولاد سے خوش ہی خوش رکھا تھا۔ سونے آنگن کو تین تین بچوں کی چیخ و پکار خاصا آباد کر دیتی ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ عورت ہونے کے ناطے خود بی ذکیہ ہی ایک ننھے منے وجود کے لئے ترستی تھیں۔ شادی کو چھ سات سال تو ہو ہی چکے تھے کیسے کیسے ارمان جی کو لگے ہوئے تھے۔ مگر انھیں دیکھ کر تو بجائے پیار کے ان کے آگ لگتی تھی۔ اپنے ہوتے تو کلیجے سے لگائے لگائے پھرتیں۔ مگر اب تو ان کی ہنسی، ان کی چیخ پکار جیسے کانوں میں چھید ڈالتی۔ بات بے بات دھتکارا کرتیں۔ خواہ مخواہ ڈانٹ ڈپٹ کرتیں۔ غصے کی بات پر بھی غصہ اور پیار کی بات پر بھی غصہ۔

پہلے پہل شادی ہوئی تو بچے چھوٹے چھوٹے تھے، سمجھے کہ ہماری ہی ماں ہوگی۔ مگر پہلی ماں ایسی تھی کہ بھول سے بھی پھٹکار نہ کرتی۔ غصے کی حرکت پر بھی پیار کرتی اور پیار کی حرکت پر بھی پیار ہی کئے جاتی۔ بھول سے کبھی پھول کی چھڑی بھی نہ چھوائی۔ ایڑیاں گھس گھس کر جو ضد کی پوری کر دی۔ وہی اماں اب کیسی ہوگئی تھی کہ دیکھتے ہی آنکھوں میں خون اتار لیتی۔ کہاں تو وہ پیار دُلار اور کہاں یہ روز روز کی پھٹ پھٹکار۔ بچے ہی تو تھے، تھوڑے ہی دنوں میں یہ حال ہوگیا کہ ماں سے کٹے کٹے رہنے لگے۔ دن بھر میں دو چار باتیں کر لیتے تو کر لیتے، ورنہ تینوں آپ ہی آپ روٹھتے بھی منتے بھی۔ بہت ہوا تو شام کو باپ کے سامنے شکایت کر دی۔ نہیں تو دادی کی جان پر ستم توڑنے لگے۔

ساس بہوؤں کی آپس میں کبھی نہیں پٹتی۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اب یوں دیکھو تو پوتے بھی تھے اور پوتی بھی، اب کون ارمان بھلا ان کے جی کو لگا رہ گیا تھا۔ مگر گھونگٹ بھی نہ اُٹھا ہوگا کہ ساس نے بات پیچھے طعنہ دینا شروع کر دیا۔

نہ کبھی ذکیہ بیگم کے دن چڑھے نہ ساس کی زبان رُکی۔ مہینے پیچھے ہر بار ذکیہ بیگم کو آس بندھتی کہ ممکن ہے اب کے سے حمل رہ گیا ہو۔ مگر وہ اسی پابندی سے نماز ناغہ کرتی رہیں۔

اور ساس اسی لگن سے طعنوں کے تیر برساتی رہیں۔ اور اِدھر ہر لمحہ ذکیہ بیگم کی آنکھوں میں منا، شانو اور بے بی کھٹکنے لگے۔

کہنے والوں نے جھوٹ نہیں کہا ہے کہ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ایک بار یونہی ذکیہ بی کے متلی اُٹھی، قے ہوئی اور چکر پر چکر آنے لگے۔ ہاتھوں پیروں کا دم ہی جیسے جاتا رہے پلنگڑی سے لگ گئیں۔ متلی چکر میں دنوں کا حساب بھی بھول گئیں اور مہینہ چڑھ گیا۔ دوسرے مہینے پلنگ چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ کام کاج میں چلنے پھرنے لگیں، تو ساس نے دیدے گھما گھما کر دیکھنا شروع کیا۔ متلی چکر تو تھے ہی۔ چہرے کا رنگ بھی پیلا پڑ گیا تھا اور چال میں یہ بھکا بھکا پن! ادن گزرے جارہے ہیں اور بہو ہیں کہ پابندی سے نماز پڑھے جاتی ہیں۔

ساس کو بڑا ارمان تھا کہ پانچ پوتوں کی دادی کہلاؤں۔ ذکیہ بی تو اپنے رب سے اتنی مایوس تھیں کہ اس قسم کی خوش نصیبی کا خود پر گمان ہو ہی نہ سکتا تھا۔ مگر ہوا یہ کہ دو چار مہینے بعد پیٹ سامنے ہی سامنے بڑھا چلا آنے لگا اور ہر اچھی بُری چیز کے لئے طبیعت للیانے لگی۔ کبھی کھٹے بیر ہیں تو کبھی تیز تیز مونگ کے بڑے۔ کبھی جوار کی باسی روٹی کے ساتھ اچار پہ طبیعت اُمڈ رہی ہے تو کبھی اودی اودی جامنوں پر۔ ذکیہ بی کو کیسی کیسی شرم آتی کہ میاں بھلا کیا سوچیں گے کہ یہ ایسی اَل کھاؤنی کیسے ہو گئی ہے کہ ہر چیز پر مکھیوں کی طرح ٹوٹی پڑ رہی ہے۔ مگر ایک دن محلے کی دائی نے جو یونہی اماں جان سے گپ لڑانے چلی آئی تھی، یہ انکشاف کر کے کہ بہو بیگم کو تو پانچواں بھر رہا ہے۔ ذکیہ بی کے دل کے آنگن میں سو سو گلاب کھلا دیئے۔ آنکھوں کی پتلیوں میں چاند چمکنے لگے۔ دل کے کسی کونے سے آپ آپ صدا آنے لگی:-

" سو جا رے میرے پیارے سو جا رے میرے بالے "

ذکیہ بی ان دنوں زمین پر نہیں آسمانوں پہ چلتی تھیں اور ہواؤں میں اُڑتی تھیں ساری تیزی تندی، ساری بد مزاجی ہوا ہو گئی۔ وہی ساس کہ جن سے لڑتے جھگڑتے اِدھر کا سورج اُدھر ڈھل جاتا اب ایسی پیاری ہو گئیں کہ اماں جان ہیں تو سب کچھ ہے۔ " اماں جان کے دانتوں میں زور ہی کہاں ہے کہ بیچاری کچھ سخت گرم چبا سکیں۔"

کبھی ستریاں پک رہی ہیں تو کبھی نرم نرم گلتھی، کبھی بادلوں کے آملے کا حلوہ ہے تو کبھی بادام کا حریرہ ۔ بچوں سے بھی آپی آپ ملتی ہو گئی ۔ جو چیز آ رہی ہے سب مل بانٹ کر کھا رہے ہیں ۔ بچے نیچے ہی ٹھہرے، نگاہ میں نرمی دیکھی تو ادھر ہی ڈھلک پڑے ۔ بچے ماں کے اس پاس منڈلا رہے ہیں ۔ میاں سے تو تو، میں میں کی بجائے پیار دلار کی باتیں ہو رہی ہیں ۔ چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے ۔ میاں تو بیچارے سدا ہی کے سیدھے سادے تھے ۔ یہ آپی اینٹھ جاتی تھیں ۔ اب گھر پر خوشیوں کا دور دورہ تھا، کونے کونے سے مسرت ٹپکی پڑتی تھی ۔

چلّہ نہا کر اٹھیں تو پھر گھر کے کام کاج گلے پڑ گئے ۔ مگر اس میں بھی ایک لطف تھا ۔ اِدھر اُدھر سے آ کر بچے کا منہ چوم جاتیں، گود میں اٹھا لیتیں ۔ سینے سے لگا لیتیں، پیشاب کر دیا ہوتا تو پوتڑا بدل دیتیں ۔ روئے نہ روئے آپی آپ بہلاتیں ۔ مناتیں ۔ اور جو کبھی رو ہی دے تو کس کی ہانڈی، کہاں کی روٹی، ہانڈی جلتی ہے تو سو بار جلتی رہے روٹی کوئلہ بنتی ہے تو ہزار بار بنتی رہے، جیسے ایسا لال! لاکھوں روپے وار پھینکوں ۔

محلے والیاں خواہ مخواہ ہی اتراتی پھرتی تھیں کہ دودھ نہیں اترتا، بچے کا پیٹ نہیں بھرتا ۔ میوے کھا رہی ہیں ۔ پھل چوس رہی ہیں، حریرے ڈھکوس رہی ہیں اور پھر بھی شکایت کہ دودھ سوکھتا جا رہا ہے ۔ یہاں تو بی ذکیہ نے کبھی میوہ چکھا نہ پھل کی خوشبو ہی سونگھی ۔ یہ تک نہ جانا کہ حریرہ کیا بلا ہے ۔

بچہ پلانے کو بیٹھیں تو لگتا کہ بس دو نہریں ہیں کہ اُمڈی چلی آ رہی ہیں ۔ کیسا بہتونی دودھ تھا کہ دن بھر میں بچے کو چار چھ بار پیٹ بھر بھر پلانے کے بعد بھی تین چار کرتے بدلنے پڑتے ۔ جب تک گود میں لیتیں محبت کی ایسی لہریں اٹھتیں کہ بنا کھائے پیے ہی دھاریں بہہ نکلتیں ۔ بچے کو پا کر ہر چیز سے بے نیاز ہو گئیں ۔ ساس کہہ کہہ کر مر جاتیں مگر حلق سے نوالہ نہ اترتا ۔

اچھا برا تو اوپر والا ہی کرتا ہے ۔ کون جانے کس بات میں اُس کی کیا مصلحت چھپی ہے ۔ ہم لاچار بندے تو بس یہی کہہ کر دل کو تسلی دے سکتے ہیں کہ اللہ کا جو کام ہوتا ہے، مصلحت سے ہی ہوتا ہے ۔

گرمی کے دن تھے، بدن تھے کہ جھلسے جا رہے تھے۔ اترتی دھوپوں میں بچے کو ٹھنڈے پانی سے نہلایا۔ گرمی کے دانوں کے مارے جسم بھر بھر آگیا تھا۔ موٹا تازہ۔ گد گدا بچہ پانی کے ٹب میں بیٹھا تو لگا چھپ چھپ کرنے کے چھپا کے اڑانے۔

بچے کو خوش دیکھ کر ماں کا جی کیسا خوش ہوتا ہے! ذکیہ کے دل میں کوئی جھانک کے دیکھتا، گلزار کھلے جا رہے تھے۔

"وہی ڈاہن غضب خدا کا! ایسی چلکتی دھوپ میں کھلے آنگن میں بچے کو نہلائے جاتی ہو اور اتنی دیر سے پانی میں بٹھال رکھا ہے۔ دھوپ لگ جائے گی نا!"

"اماں جان گرمی تو دیکھئے نا۔ جھلسا جا رہا تھا۔ اب کیسا خوش ہو رہا ہے!"

"خاک خوش ہو رہا ہے۔ نمونیہ ہو جائے گا، ہاں!"

ذکیہ بی کو ہنسی آگئی:۔ "نمونیہ؟ اوئی اماں جان! بھلا دھوپوں کے دنوں میں نمونیہ ہو گا!"

"تم کو بھلا کیا تجربہ ہے بی بی؟ تمہاری بڑی نند کی بچی یوں ہی جاتی رہی، اچھی خاصی، کھیلتی مالتی۔ بس نہلانا ہی بہانہ ہو گیا۔ مگر تم لوگ کسی کی مانو ہو۔ اگلے زمانے والوں کو تو تم نئے لوگ یوں ہی چٹکیوں میں اڑاتے ہو۔"

ذکیہ بی نے ہنستے ہنستے سفید تولیہ میں لپیٹ بچے کو اٹھا لیا۔ اور راشد میاں نے روتے روتے سفید ململ میں لپیٹ قبر میں سلا دیا۔

دو ہی چار دنوں میں ذکیہ بیگم کا کیا حال ہو گیا: ذرا سا منہ نکل آیا۔ ہاتھ پاؤں سوکھ گئے، دل رہ رہ کے بس ہو ہو کئے جاتا۔ اپنے دیدوں دیکھتے، اپنے ہاتھوں بو کو نہلایا تھا، سفید ململ میں لپیٹ کر موگرے کے ڈھیر میں چھپا دیا تھا۔ گر ماتا کا مارا، بے کل جی چین پائے تو کیسے؟ کونے کھدروں میں جھانکتی پھرتیں۔ کبھی چولہے کے پاس دیکھتیں تو کبھی دالان میں۔ یہاں تو نہیں چھپ گیا؟ وہاں تو نہیں چھپ گیا؟ اماں جان آپ نے تو نہیں دیکھا؟ یہیں تو سویا تھا! ابھی کے ابھی میں کہیں چلا گیا؟ کہاں کھو گیا۔

روتے روتے آنکھوں میں گلابی گلابی دھبے تیر گئے بو پکارتے پکارتے ہونٹ

پڑ گئے۔ مگر بوکو آنا تھا نہ آیا۔ عمر بھر کے لئے کلیجے کو پھانس لگا کر چلتا بنا۔ بو پھول تھا ذکیہ بی چمن۔ پھول گیا تو کیا چمن اور کیا چمن میں بہار! وہی دن تھے اور وہی راتیں۔ بات بات پر اُلجھ پڑتیں۔ پاگلوں جیسی حرکتیں کرتیں۔ کاٹنے کو دوڑتیں۔ بعد میں پھر کبھی تو گود ہری نہ ہوئی۔ ان کی قسمت میں اوپر والے نے ایک ہی پھل رکھا تھا۔ وہ بھی ادھ پکا۔

باپ کو دیکھتے ہی بچے آگے پیچھے جھول گئے :-

"ابّا! ابّا! بلونگڑوں نے آنکھیں کھول دی ہیں۔"

"اچھا؟" وہ ذرا بناوٹی حیرت سے بولے۔

"ہاں ابا! اور اب تو وہ ذرا دور تک گھوم پھر بھی لیتے ہیں۔"

بلّی کا ٹھکانا آج کل ذکیہ بی کے اپنے کمرے میں تھا۔ سات گھر گھمانے کے بعد اس نے چھپر کھٹ نیچے ہی اپنی ٹیک لگائی۔ ذکیہ بی کے چھپر کھٹ کے پاس راشد میاں کا بڑا سا پلنگ تھا۔ بچّے باپ کے پلنگ پر چڑھ گئے اور سر نیچے جھکا جھکا کر رینگتے ہوئے بلونگڑوں کو دیکھنے لگے۔

راشد میاں نے بھی سر جھکا کر دیکھا :- پوسی بڑے اطمینان سے دودھ پلا رہی تھی۔ چھوٹا بلونگڑا اس کی دم کے پاس پڑا پیاؤں پیاؤں کر رہا تھا۔

"ارے اس کالے دھبوں والے کو کس نے ماں کے پاس سے ہٹا دیا۔"

راشد میاں ذرا الجھ کر بولے۔

"میں نے" شانو سہم کر بولا۔

"اور جو اس کی ماں اس کو اِدھر اُدھر ڈھونڈتی پھرے گی؟"

"وہ وہیں تو چپکا ہے ابّا، ذرا منہ موڑے گی تو آپ دِکھ جائے گا۔"

"خبردار! جو بلونگڑوں کو کبھی ماں سے الگ کیا۔ وہ سارے میں چلاّتی پھرے گی۔ ہاں سُن لو۔" راشد میاں کے بگڑے تیور دیکھ کر تینوں بچّے سہم گئے۔

ذکیہ بی، جو توے پر روٹی ڈال رہی تھیں۔ روٹی کے ساتھ ساتھ اپنا پنجہ بھی ڈال گئیں۔ "سی" کی آواز ان کے منہ سے نکلی۔ انگلیاں جل کر کوریا ہو گئیں تھیں۔

"خبردار! جو بلونگڑوں کو ماں سے الگ کیا" ان کے کانوں میں بس یہی گونج باقی رہ گئی، "خبردار! خبردار! خبردار!"

رات کے کھانے پر آلو کا سالن تھا۔ جو میاں کا من بھاتا کھاجا تھا۔ مسور کی دال، چپاتیاں اور کھیر۔ آلو کے سالن میں غلطی سے مرچیاں زیادہ پڑ گئیں تھیں۔ سوسو کر کے کھائے جا رہے تھے۔ بی بی نے کھیر کا پیالہ سامنے بڑھایا:۔

"ایسا بھی کیا بس کھائے جا رہے ہیں۔ ہٹائیے رکابی سامنے سے۔ ذرا سی کھیر تو لیجیئے، ٹھنڈک پڑ جائے گی۔"

"اہا کھیر!" راشد میاں خوشی سے بولے۔ میٹھوں میں کھیر پر دم دیتے تھے۔ پیالہ پکڑ جلدی جلدی چمچے چلانے لگے۔ زبان میں اس بری طرح جلن ہو رہی تھی کہ میٹھے سے بھی آگ بجھی نہیں۔ ابھی سُوسُو جاری ہی تھی کہ پیالہ پکڑ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"کہاں جا رہے ہیں؟" ذکیہ بی حیرت سے بولیں۔

ہنس کر بولے: "ذرا پوسی کو کھلا دیں تھوڑی سی۔"

ذکیہ بی ذرا بُرا مان کر بولیں: "خود آپ کے منہ کی آگ تو بجھی نہیں اور بلّی کا چونچلا سوجھ رہا ہے۔ کھا لیجیئے نا۔ آپ کا تو پسندیدہ میٹھا ہے۔"

"بلی بھی تو پسند کی ہے۔ ایسا بھی کیا ہے۔ بیچاری نے دو دو بچے جنے ہیں، کچھ تو مال اسے بھی تو ملے۔"

باپ کے ساتھ بچّے بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "ہاں ابا! ہم کھلائیں گے، ہم بھی کھلائیں گے۔"

ذکیہ بی نے سامنے سے رکابی سرکا دی۔ "حلق سے اترے تب نا!"

لگتا تھا سارے گھر والوں کے دلوں پر بلی چھا کر رہ گئی ہے۔ اماں جان نے ریشمی کترنوں سے بلونگڑوں کے لئے گلوں میں ڈالنے کو پٹے سیئے۔ جن پر دو دو پیسوں میں ملنے والے چھنکتے گھونگھرو بھی ٹانک دیئے۔ سردیوں کے دن تھے، اس لئے راشد میاں نے ماں سے سفارش کی کہ بلّی کے لئے چھوٹا موٹا۔ پرانے دھرانے کپڑوں کا نہالچہ سی دیا جائے۔ پوسی سردی سے مر نہ جائے گی؟

بلی خالہ کے کیا ٹھاٹ تھے : مزے سے گدے پر لیٹی ہیں ۔ ادھر پیلا بلونگڑا اُدھر کالا بلونگڑا ۔ گھڑی دو گھڑی کو پڑوسیوں کے گھر کی خیر خبر لے کر، گھوم گھام کر آتی ہیں، پھر پہلو میں بلونگڑے ہیں اور ان کی زبان ۔ پتلی سی زبان سے اتنا چاٹیں کہ بلونگڑے موئے گیلے گیلے ہو جاتے ۔

باپ کی اجازت سے بچے بلونگڑوں کو اُٹھا کر دالان میں لے آتے اور گھر بھر کو تماشہ ہو جاتا ۔ شانو اپنا گیند پھینک دیتا اور بلونگڑے اس کے پیچھے لپک پڑتے بستر بچھائے جاتے تو بلونگڑوں کو نئی شرارت سوجھ جاتی ۔ چاروں، گدوں پر لوٹے پڑتے ۔ دو چار کمر دبے جب تک بچوں کے ہاتھوں پر نہ پڑ جاتے نہ یہ مانتے نہ وہ مانتے

میاں ہنس کر بتاتے : ۔

" دیکھا ذکا ؟ بدمعاشوں نے میرے ہاتھ بھی لہولہان کر ڈالے ۔"

ان کے لہجے میں پیار ہی پیار بھرا ہوتا ۔

" سب بلی اور اس کے بچوں کے دیوانے ہیں ۔ کسی کو فرصت نہیں کہ دو گھڑی کو میرا بھی حال پوچھ لے ۔" ذکیہ بی نے بڑے کرب سے سوچا ۔

سردیوں کی راتیں تھیں، چٹاخے کی سردی پڑ رہی تھی ۔ محراب میں نیچی لو سے قندیل جل رہی تھی ۔ سب رضائیوں میں سکڑے سمٹے پڑے تھے ۔ بڑے سے پلنگ پر تینوں بچے آڑے آڑے سوئے تھے اور خود چھپر کھٹ پر راشد میاں کے پہلو میں ذکیہ بی ۔ ذکیہ بی نے منہ پر سے رضائی سرکائی اور بے چین نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا، سبھی سو رہے تھے ۔ رضائی کو دھیرے دھیرے کمر تک، اور پھر پیروں تک سرکا دیا ۔ ہولے سے بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئیں ۔ میاں نے جو پلنگ ہلتا محسوس کیا تو مُندی مُندی آنکھوں سے بیوی کو دیکھ کر بولے : ۔

" کیا کر رہی ہو ! "

" ایسے ہی پیاس لگی ہے ۔"

میاں پھر کروٹ لے کر سو رہے ۔

ذکیہ بی چھپر کھٹ سے اُتر کر کھڑی ہو گئیں میاں کے منہ پر جھک کر اطمینان کر

لیا کہ کہیں کچی نیند تو نہیں ہے۔

تھوڑی دیر یوں ہی کھڑی رہیں۔ میاں خر خر کر رہے تھے۔

ذکیہ بی نے اطمینان کی سانس لی۔ نیچے بیٹھ کر چھپر کھٹ کے نیچے جھانکا۔ بلی کہیں سیر کو گئی تھی۔ دونوں بلونگڑے گادی پر خر خر کرتے پڑے تھے۔ ذکیہ بیگم کی سانس اوپر نیچے ہونے لگی۔ دل کو دبا کر انہوں نے گدی کا کونہ پکڑ کر ہولے سے اپنی طرف کھینچا۔

"پیاؤں پیاؤں" دھکا کھا کر دونوں نسری سری آواز میں چلاّنا شروع کر دیا۔ مدھم سی روشنی میں دونوں بلونگڑے بڑے پیارے لگ رہے تھے۔ دھکے سے ان کی نیند میں خلل آ گیا تھا اس لئے بیچ بیچ آنکھیں کھول کر انہوں نے ناگواری سے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔

ذکیہ بی نے گدی اس انداز سے لپیٹی کہ دونوں بلونگڑے اس میں اچھی طرح لپٹ جائیں پھر تہہ کی ہوئی گدی کو لے کر دھیرے دھیرے آگے بڑھتی۔ دیکھتے دیکھتے وہ آنگن میں نکل آئیں۔

کمرے میں نیم گرم سی فضا سے نکل کر باہر اک دم شدید سردی میں اکڑی ہوئیں۔ مگر انہیں سردی کا کوئی احساس نہ ہوا۔

گیارہ بجے کا عمل تھا۔ مرزا صاحب کے گھر سے اب تک باتوں کی اور ہنسی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بیگم مرزا کا بڑا اصرار تھا کہ تمہاری بلی کے بلونگڑے ہوں تو ہمیں دینا۔ پوسی تھی تو ویسی بلّی، مگر یہ بڑے بڑے جھالردار بال، گدگدے، نرم نرم، موٹے موٹے پنجے، بھاری بھرکم۔ بلونگڑے بھی ویسے ہی ہوئے۔ محلے بھر میں بہت سوں کے دانت تھے۔

بیگم مرزا اس وقت ذکیہ بی کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئیں۔

"اس وقت؟ خیریت تو ہے؟" وہ بوکھلا کر بولیں

ذکیہ بی نے بازو کے نیچے سے لپٹی ہوئی گدی نکالتے ہوئے کہا:۔

"کیا کہوں بہن؟ تمہارے کہے کا کس قدر پاس تھا مجھے، روز سوچتی تھی لا کر دوں گی، مگر بچے اور ان کے باپ چھوڑیں تب نا! اب سو گئے ہیں تو لے آئی ہوں۔ اور اتفاق سے پوسی بھی کہیں باہر گئی ہوئی ہے۔ مگر بہن! انہیں کہیں اندر ہی چھپا لینا نہیں تو پھر واپس لے بھاگیں گے۔"

بیگم نے دیوانوں کے سے انداز سے بلونگڑے چھین لئے۔

"ارے دونوں ہی!" ان کی آواز میں خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی تھی

"ہاں مجھے معلوم تھا بہن! تمہیں بلیوں سے بڑا پیار ہے۔ اس لئے دونوں ہی کو لے آئی ہوں۔ ایک بلا ہے ایک بلی۔ اب نسل چلاتی رہو" ذکیہ بی نے گھبرائی ہوئی ہنسی کے ساتھ کہا۔

بیگم نے ان جانے میں ایک تیر چلایا :۔

"ان کی ماں تو نامراد ہائے ہائے نہ مچائے گی؟"

بہت دیر تک تو ذکیہ بی کو جواب ہی نہ سوجھا، پھر اکھڑے اکھڑے لہجے میں بولیں :۔

"بڑے بھی تو خاصے ہو گئے ہیں نا" بڑے مشکل سے وہ ہونٹوں تک ہنسی کو گھسیٹ کر لا سکیں۔

"اے بہن! بڑے چھوٹے کی نہ کہو، ہوتی آخر اولاد ہی ہے ...."

ذکیہ بی نے ان کی بات پوری ہونے سے قبل ہی کہنا شروع کر دیا تھا :۔ "تو بہن رکھ کہاں رہی ہو انھیں؟"

بیگم نے سامنے ہی دالان میں دھرے صندوق کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں ایک گدیلا بچھوا دوں گی، مزے سے رہیں گے۔ اور اس صندوق میں اتفاق سے ایک بڑا سا سوراخ بھی ہے، ہوا آتی رہے گی۔"

ذکیہ بی جب دسمبر کی کڑکڑا دینے والی سردی میں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں تو ان کے ماتھے اور گردن پر پسینے کے بڑے بڑے قطرے جگمگا رہے تھے۔ ڈگمگ قدموں سے چلتی وہ اپنے پلنگ تک آئیں اور میاں کے بازو پر دھپاک سے گر پڑیں۔

صبح سارے گھر میں ہڑ بونگ مچی ہوئی تھی۔

بچے الگ بدحواس تھے، اماں جان الگ چنگھاڑ رہی تھیں۔ اور راشد میاں تو ساکت ہی رہ گئے تھے۔ سب سے زیادہ قابل رحم حالت پوسی کی تھی۔ میاوں میاوں کر کے سارا گھر سر پر اُٹھا لیا تھا۔

بلونگڑے آ ز گئے تو کہاں گئے؟

بس ایک ذکیہ بی تھیں کہ روز کی طرح ہر چیز سے بیگانہ خاگینہ پکاتی بیٹھی تھیں۔

"بے بی سے پوچھے ابّا۔ ایک دن یہ اپنی سہیلی زرینہ سے کہہ رہی تھیں کہ بلونگڑے بڑے ہو جائیں گے تو ایک تم کو دے دیں گے" شانو بولا۔

"واہ وا! اچھے ہو جی تم" منا بے بی کی حمایت میں بولا،

"وہ بے چاری تو خود اتنا پیار کرتی تھی، چپ ٹالنے کو کہہ دیا ہوگا۔"

"دیکھئے نا بھائی جان" بی بی نے اپنا ایک حمایتی پاکر خواہ مخواہ بسورنا شروع کر دیا،

"ہمیں الزام دے رہے ہیں خواہ مخواہ"

"دادی اماں سے پوچھیے۔ وہ ہمیشہ بولتی تھیں کہ بلو نگوڑے گندگی کے دشمن ہیں۔ اُنھوں نے تو کسی کو نہیں دبے دیئے؟"

"خاموش رہو بے وقوف" راشد میاں نے منے کو ڈانٹ دیا۔

"بلی نہ کہیں اُٹھا کر لے گئی ہو" راشد میاں تھوڑی دیر چپ رہ کر بولے

"اے واہ! سات گھر تو اس نے پھیرا دیئے۔ اب کہاں لے جاتی بھلا؟ ذرا آپ میں نے خود چھپر کھٹ نیچے دیکھے"

اور اُنھوں نے بے اعتباری کے انداز سے بہو کی طرف دیکھا۔

"اور میں کہوں اگر خود ہی اُٹھا کر لے جاتی تو یوں کلپ کلپ کر میاؤں میاؤں کیوں کرتی؟"

بات تو واقعی دل کو لگتی ہوئی تھی، مگر راشد میاں کی کسی صورت تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔ پھر شک و شبہ سے بولے:۔

"کسی بلے ولے نے نہ کھائے ہوں"

"سردی کے مارے دروازے تو سارے بند کر لیتے ہیں، پھر بلا آئے تو کدھر سے؟۔ روشن دان بھی کھلے نہیں رہتے"

ہر بات کا واضح جواز موجود تھا۔ پھر؟

"میاؤں — میاؤں — می آؤں"

بلی بُری طرح چلا رہی تھی۔ رہ رہ کر چھپر کھٹ کے نیچے جاتی، گودام کی طرف دوڑتی، مودی خانے کے چکر کاٹتی اور پھر جا کر گدی کو منہ سے گھسیٹنے لگتی جو ذکیہ بی نے جہاں کی تہاں پھینک دی تھی۔

"ڈکھیا کا صبر پڑے۔ جس نے بھی اس کا کلیجہ کاٹا ہے"

اماں جان نے کلپ کر کوسا دیا۔

ذکیہ بی بیٹھے ہی بیٹھے سر سے پاؤں تک تھرا گئیں۔ بچے الگ رنگ رنگ کی بولی بول رہے تھے۔ راشد میاں ہر بار نئی بات سمجھا رہے تھے اور اماں جان کوسنوں کی بھرمار کر رہی تھیں ایک ذکیہ بی کی زبان بند تھی کہ ایک دم ساس نے ان سے پوچھا۔

" دلہن بیگم، تم نے کہیں دیکھے ہیں بلونگڑے ؟ "

ذکیہ بی نے اپنی ساری طاقت سمیٹ کر منہ سے آواز نکالی :۔

" میں کسی کے لینے میں نہ دینے میں، میں کیا جانوں ؟ "

صبح سے اب تک یہ پہلی بات تھی جو ان کے منہ سے نکلی، ورنہ وہ خاموش ہی تھیں۔

بلی نے پورے گھر کے چکر لگا ڈالے مگر بلونگڑے ملنے تھے نہ ملے۔ چار چار، چھ چھ منٹ کو باہر سے آتی اور چھپر کھٹ کے نیچے گھس جاتی اور ایسی درد بھری آواز سے میاؤں میاؤں کرتی کہ ذکیہ بی بی کا دل تھرا تھرا اٹھتا۔

" رانڈ دودھ کے مارے لوتھن بن گئی ہے۔ جانور ہو یا انسان ہو، مئیا محبت تو اللہ نے سب کو لگا دی ہے۔" اماں جان، جو سدا بلونگڑوں کو خیرات کر دینے کے بارے میں لیکچر دیتی رہتی تھیں، آج ماتا کی پکار کے آگے سپر انداز ہو چکی ہیں۔

بچے اداس اداس اسکول سدھارے۔ راشد میاں منہ لٹکائے آفس چلے گئے۔ اور اماں جان کا دل اس دن میون میں نہ لگ سکا۔

لاکھ جانور کے بچے تھے، مگر دن بھر اچھل پھاند ہوتی تھی۔ تاگے کی گنڈی دیکھ پاتے تو اس سے اتنے پنجے چلاتے کہ وہ کھل کھلا کر الجھ الجھ جاتی۔ کترنوں کی دھول دھانی کرتے۔ آنی پھینکم پھانک کرتے کہ سارے میں کترنوں اور تاگوں کا جال بچھ جاتا۔ اماں جان بھی منہ لپیٹ کر پڑ رہیں پوسی کی پکار نے ان کا کلیجہ ہلا دیا تھا۔

دو بجے پوسی پھر آئی : پیشانی کے پاس سوکھا ہوا خون جما ہوا، ناک پر مار کے نشان، منہ ایک طرف پھول گیا تھا، ایک پاؤں سے لنگڑاتی ہوئی، اور گدی کے پاس بیٹھ کر مری مری آواز میں میاؤں کرنے لگی، یوں جیسے روتی ہو۔

سب اپنی اپنی بولی بول چکے تھے۔ بس ذکیہ بی کی دل کی دل میں رہ گئی تھی۔ سب کی باتیں ٹکر ٹکر سنتی رہیں اور خاموش بیٹھی رہیں۔ اس خاموشی کا اتنا شدید یہ رد عمل ہوا کہ دوپہری

سے انھیں سنسنا کر بخار چڑھ آیا۔

ساس نے کانپتا دیکھا تو اٹھیں اور دالان سے اُٹھا کر کمرے میں جا لٹایا اور رضائی اُڑھا دی۔ ایک رضائی سے جاڑا نہ گیا تو دوسری بھی لا اڑھائی۔

بچّے اسکول سے لوٹے تو گھر پر سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ دادی ہمیشہ کی طرح میوں نہیں کر رہی تھیں۔ اور اماں بھی چولہے کی بجائے پلنگ پر منہ لپیٹے پڑی تھیں۔

شانو بڑی اداسی سے بولا: بلونگڑے نہیں ہیں تو گھر کیسا لگ رہا ہے بھائی جان!"

منا کچھ نہ بولا۔ دکھ سے سانس لے کر رہ گیا، جیسے جی پر بہت بوجھ ہو۔

"ہائے اللہ اپن نے تو نام بھی سوچ لئے تھے۔ تارا اور سورج۔ کیوں بھائی جان، وہ پیلے دھبوں والے بلونگڑے کا نام سورج ہی سوچا تھا نا، جو بلا تھا؟"

دکھے دل سے منا بولا: ہاں بے بی! سورج چلا گیا اور تارا بھی چلی گئی اور اب گھر کیسا اندھیارا اندھیارا سا لگتا ہے۔"

"بڑی عجیب بات ہے کہ چور کا پتہ نہیں چلتا" شانو حیرت اور پریشانی سے بولا۔

بے بی کا ننھا دل محبت اور غصے سے چور چور ہو رہا تھا۔ دانت کچکچا کر بولی:۔

"اگر مل جائے نا تو ٹھاں سے بندوق مار دوں"

منّا غم سے بولا: ہم تو پھر ان کے مالک تھے۔ اس کی ماں کا حال تو سوچو ذرا۔ ایک دن کبھی ابّا دیر سے گھر پہنچتے ہیں تو دادی اماں کتنی پریشان ہو جاتی ہیں"

تینوں خاموش ہو گئے، مگر لگتا تھا کہ ان کے معصوم دلوں سے بلونگڑوں کی یاد کبھی نہ مٹے گی۔

"اماں کچھ پتہ چلا؟" راشد میاں نے گھر میں داخل ہوتے ہی ماں سے پہلا سوال کیا۔

اماں جان نے اٹکل سے تیر چلایا! "جس کے دل کو ماں کی مامتا کا درد ہوئے وہ ڈھونڈھیا کرے۔ ایسا بھی کیا موا کوراپن"

اماں کا شبہ آجا کر بہو پر جا رہا تھا۔ "موئی نامراد زخموں سے چُور چُور تھی"

"کون چور چور تھا اماں؟" راشد میاں نے حیرت سے پوچھا۔

"اے وہی تمہاری بلی۔ جانے کدھر کدھر کھوجتی پھر رہی ہے کہ سارا منہ سجالائی ناک

الگ سوجی ہوئی، پیشانی الگ۔ زخموں زخم۔ خون بھی بہہ رہا تھا۔"
"ہوں" ایک بہت لمبی ٹھنڈی سی سانس آپ ہی آپ راشد میاں کے حلق سے نکل پڑی۔
جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ گلی کی مسجد سے مغرب کی نماز کی اذان بلند ہوئی۔
شانو سرگوشی میں منے اور بے بی سے بولا:۔
"بھائی جان! او بے بی! چلو مسجد میں چل کر دعا مانگیں کہ اللہ ہماری بلّی کے بچّے......
دل برداشتہ بے بی بولی:۔ "اللہ میاں ہماری دعا کاہے کو سننے لگے۔"
"سچ مچ" منّا گھبرا کر بولا:۔ ایسا نہیں کہتے، گناہ ہوتا ہے۔
دھڑ دھڑاتے ہوئے وہ تینوں آگے پیچھے بھاگنے لگے۔
"اے نامرادو! یہ کون کھیلنے کا وقت ہے؟" پیچھے سے دادی اماں چلائیں
آنسوؤں میں نتھرتی بے بی کی بے بس آواز آئی:۔
"دادی اماں! ہم اللہ میاں سے دعا مانگنے جا رہے ہیں۔"
رات کے نو بجے سردی اپنے زور پر تھی، ادھر ذکیہ بی کا بخار اپنے شباب پر تھا
رضائی پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ آنکھیں سرخ، ہاتھ پاؤں کانپتے ہوئے، بال الجھے
میاں نے ہڑبڑا کر پوچھا:۔
"کیا کر رہی ہو ــــ؟"
"ایسے ہی جی گھبرا رہا ہے۔ ذرا باہر جاؤں گی۔"
"مگر اس وقت اتنی سردی میں؟ تمہیں بخار ہو رہا ہے نا؟"
"تو کیا ہوا؟" وہ کانپتی آواز میں بولیں اور جلتی جلتی دروازہ کھول کر باہر نکل
دروازے پر اتنی رات گئے انھیں کھڑا دیکھ کر بیگم مرزا حیرت سے بولیں:
"تم؟ ارے، یہ کیا حال ہو گیا ہے تمہارا؟ کیا بات ہے بہن؟ خیریت تو
وہ ان کے سوال کو نظر انداز کر کے بولیں:۔ "بلو نگوڑے کہاں ہیں؟"
"وہیں ہیں ــــ کیوں؟" پھر ہنس کر بولیں، "وہ تمہاری پوسی آ
بچوں کی بُو پا گئی کہ بار بار صندوق کے گرد گھیرے ڈالتی تھی، سر پٹختی تھی۔ میں نے بھگا
بہت ستانے لگی تو غفورے نے دو ایک پتھر ایسے کس کے مارے کہ منہ الگ سوجا

الگ لنگڑا گئی " وہ زور زور سے ہنسنے لگیں۔

" اور بلو نگڑے ؟ " ذکیہ بی نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

" وہ موئے اُداس اداس سے ہیں۔ دودھ دیا بھی، گر منہ تک نہیں لگا رہے ہیں بُری بری آوازوں سے رو رہے ہیں "

ذکیہ بی نے منت بھری آواز سے کہا: " کہاں ہیں وہ ؟ ایک نظر دیکھ لوں؟ "

" وہ ئی یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ؟ یہیں تو ہیں "

مرزا صاحب کی اماں دالان کے کونے میں رضائی میں سکڑی ' سوسو، سی سی، کرتی پڑی تھیں، دونوں کو صندوق کے پاس جاتا دیکھ کر بولیں:۔

" بن ماں کے بچوں کی بھی کوئی زندگی ہے موئی ! ماں کی گود کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے "

کئی سال ایک لمحے میں گزر گئے۔ اسی ایک لمحے میں ذکیہ بی دلہن بنیں، سوتیلے بچوں کی ماں بنیں۔ ڈائن، کوکھ جلی ماں بنیں۔ پھر بہو کی ماں بنیں، اور پھر اب ان کی گود خالی تھی —— !

بیگم نے آہستہ سے ڈھکنا کھولا۔

" میاؤں —— میاؤں۔ می آؤ —— امی آؤ —— امی آؤ "

بو جب روتا تھا تو یونہی، امی آؤ، کہتا تھا۔

بخار سے سنسناتا جسم کانپ کانپ اُٹھا۔ انھوں نے لرزتے ہاتھوں سے بلو نگڑے کو اُٹھا لیا۔ چونک کر بولیں:۔

" ارے دو ہی دن میں اتنے دُبلے کیسے ہو گئے ؟ "

دالان کے پرلے کونے سے مرزا صاحب کی اماں کی آواز آئی:۔

" جانوروں کی بات ہے نہ انسانوں کی، سب محبت کا سوال ہے بٹیا۔ ماؤں سے بچے چھٹیں یا بچوں سے مائیں...... "

ذکیہ بی کچھ نہیں سن رہی تھیں، بلونگڑوں کو اپنی چھاتی سے چمٹا کر بولیں:۔

" بس میں انھیں لیے جا رہی ہوں ! "

بیگم مرزا کا مزاج جاتا رہا۔ "وہ کیوں بہن؟"

منہ سے کچھ کہے بغیر ذکیہ بی جلدی جلدی دروازے کی طرف لپکنے لگیں۔ ان کی خاموشی سے بیگم کا پارہ چڑھ گیا۔

"اے واہ! خود ہی دیے اور خود ہی لئے بھی جا رہی ہیں۔ کیسی دوغلی زبان ہے بی تمہاری! کوئی یوں دومنہ کا سانپ پالتا ہے اپنی زبان میں؟"

دروازے سے نکلتے نکلتے، پیچھے مڑے بغیر تیز، مگر کانپتی ہوئی آواز سے بولیں:-

"تم نے کبھی بچے جنے ہیں؟"

وہ بے تابی سے گھر میں داخل ہوئیں، بلونگڑے ان کی چھاتی سے چمٹے ہوئے تھے۔

"منے، ساڈو، بے بی۔ دیکھو بیٹو، دیکھو میرے بچوں۔ یہ تمہارے کھلونے!"

بُوا کر ہو سی چوکس ہوگئی۔ گدی پر سے جھکولالے کر اُچکی اور بلونگڑوں پر ٹوٹ پڑی۔ دیوانہ وار چوم چاٹ کر اُنھیں گیلا کرنے لگی۔

تینوں بچے کسی اندورنی احساس سے متاثر ہو کر اک دم جاگ پڑے۔ "ابا تارا! اباجی سورج!" نیند بھری آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر بُری طرح چلانے لگے:-

"اماں جی! اباجی! یہ کہاں سے آئے؟ کہاں ملے؟ کہاں تھے؟" تینوں کے تینوں بلی اور بلونگڑے پاس پاس ناچ رہے تھے۔

ذکیہ بی کھڑی کانپی جا رہی تھیں، دونوں ہاتھوں سے اپنا دل تھام رکھا تھا۔

راشد میاں نے اُٹھ کر ان کے شانے پر پیار سے ہاتھ رکھ دیا۔

"میں جانتا ہوں ذکا دو دن سے تمہارے دل پر کتنا بوجھ تھا۔"

ذکیہ بی نے گھبرا کر میاں کو دیکھا، ان کی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔

"ہاں، جب تم بلونگڑوں کو لے کر جانے لگیں تب میں جاگ رہا تھا۔ مگر میں جان بوجھ کر چپکا بنا پڑا رہا۔ اگر میں تمہارا راز کھول دیتا تو میرے بن ماں کے بچوں کو کبھی ماں نہ ملتی۔"

سہمے سہمے انداز سے ذکیہ بی راشد میاں کو دیکھ رہی تھیں۔

"میں جانتا تھا ذکا تم بہت دنوں یہ ظلم نہ کر سکو گی۔ میرا ایمان ہے ذکیہ کہ ہر عورت کے دل میں ایک تاریک تہہ خانہ ضرور ہوتا ہے، مگر وقت پڑنے پر اس تاریکی میں ممتا کی مشعل

ضرور جگمگا اٹھتی ہے !"

"میں ۔ م ۔ م میں ......" جذبات کی شدت کے مارے ذکیہ بی کے منہ سے الفاظ نہیں نکل پا رہے تھے ۔ جب میں پوسی کی پکار سنتی تھی تو مجھے خود اپنی تڑپ اور ماما یاد آتی تھی ۔ جب میں نے سوکھے مارے بلونگڑوں کو روتے دیکھا تو ...... تو ...... میں نے سوچا کہ ماؤں اور بچوں کے لئے ایک دوسرے کے وجود کس قدر ضروری ہیں ۔ میرا دل پھٹ جاتا، میں یقیناً مر جاتی اگر میں ....."

راشد میاں نے پیار سے ذکیہ بی کا سر تھپ تھپایا ۔

"تم جی بھر کر رو لو ذکا ۔ آج تمہاری آنکھوں سے جتنے آنسو بہہ جائیں اچھا ہے ۔"

"مگر مجھے رونا نہیں آ رہا ہے ۔ انہوں نے بے بسی سے کہا اور بچوں کی موجودگی کا خیال کئے بغیر راشد میاں کے سینے سے لپٹ کر پھپک پھپک کر رونے لگیں ۔

••



(ترجمہ:- ایس- ایم حیات بادشاہ

جے- کانتن

گوری دادی بہت دیر سے سب کے ساتھ بس کے اندر کھڑی تھیں۔
سب کے اُتر جانے کے بعد اپنی بھوری رنگ کی اٹیچی اُٹھا کر نیچے اُتریں تو ایک
ساتھ کئی آوازوں نے اُن کا خیر مقدم کیا ــــ

"دادی! صرف ایک آنہ دیدو۔ تھیلی میں اُٹھا کرلے چلوں گا۔"

"ہاں جی سواری چاہیے؟"

"گماشتہ اُرہی کے مکان پہ جائیں گی نا؟ آئیے گاڑی پہ سوار ہو جائیے!"

دادی نے ایک بار اُنھیں گھیرے کھڑے لڑکوں اور گاڑی بانوں کی
طرف استفہامیہ نگاہیں ڈالیں پھر میٹھی ہنسی کے ساتھ بولیں: "مجھے کچھ نہیں
چاہیے۔ میرا راستہ چھوڑ دو میں پیدل ہی چلی جاؤں گی۔ تم سب نے میرے
گھر کا پتہ بھی جان رکھا ہے۔ اچھا، میں ہر مہینہ جو یہاں آیا کرتی ہوں لیکن مجھے
کبھی گاڑی پہ سوار ہوتے دیکھا ہے؟"

دادی بھیڑ سے نکل آئیں۔ گھونگھٹ کو ذرا آگے کھینچ کر کمر پہ رکھی تھیلی
کے بوجھ سے ایک طرف جھکی سی وہ بوڑھی دادی چلچلاتی دھوپ میں آگ
سی جلتی دھول پر قدم جمائے بھاری بھاری قدموں سے چلنے لگیں۔ ان کی

عمر لگ بھگ ستّر سال کی ہوگی پھر بھی بہت کم بوڑھی معلوم ہوتی تھیں۔ ہاں زیادہ عمر ہو جانے سے اُن کی سانسیں پھولنے لگی ہیں۔ اس تھکن کا احساس گھر پہنچنے پر ہی ہو گا۔

دادی کے خیال میں کل کے بچّے بھی۔ رکشہ پہ، گاڑی میں، سائیکل پر اُڑتے اُڑتے جا رہے ہیں۔ دھوپ اور برسات بیچارے انسان پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ دادی دل ہی دل میں مسکرائیں۔ دھوپ اور برسات کی کیا پروا؟۔ اُن کی زندگی میں دُکھ کا سیلاب سا اُمڈ آیا تھا۔ زندگی کی اس دشوار گذار راہ پر نہایت اطمینان اور تحمّل سے چلنے کی عادی ہو جانے والی دادی کو اس دھوپ کی کیا پروا؟۔

سڑک کے کنارے نیم کا ایک گھنا سایہ دار درخت کھڑا تھا۔ دادی کچھ دیر کیلئے اُس کے نیچے کھڑی ہو گئیں۔ دھوپ سچ مچ بہت ہی تیز تھی۔ تپتی ہوئی دوپہر میں ٹھنڈی چھاؤں بکھیرتے ہوئے نیم کے درخت کے نیچے کھڑی وہ بڑھیا مشینوں کے سوا کسی اور پر بھروسہ نہ کرنے والی اس بیسویں صدی میں پچھلی نسل کا نشان بنی اپنے قدموں کے بھروسے کھڑی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ٹھنڈی ہوا میں نیم کے پتّے ہل اُٹھے۔ "جے مہادیو!" بھگوان کا شکریہ ادا کرتی ہوئی دادی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہونے لگیں۔

دادی کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔ اس عمر میں بھی جب وہ ہنستی تھیں تو اُن کے دانتوں کی خوبصورتی دیکھنے والوں کو محوِ حیرت بنا دیتی تھی۔ ٹھوڑی کے ذرا اوپر دائیں طرف چھوٹا سا خوبصورت تِل ــــــ بڑھیا کو دیکھ کر کوئی بھی یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ جوانی میں یہ کتنی خوبصورت رہی ہوگی! دادی نے آنچل اُٹھا کر ہاتھ منہ کا پسینہ پونچھ لیا۔ وہ پھر چل پڑیں۔ کچھ ہی دوری کے بعد ندی کے پُل پر بچھے کنکر کے فرش پر وہ دھیمی چال سے چلنے لگیں۔ پُل کے ایک طرف نائی ویلا یدھم ہاتھ میں ٹن کا ڈبہ لئے اس ڈر سے کہ کہیں دادی کو چھوت نہ لگ جائے سارا بدن سمیٹے کھڑا تھا۔ دادی کو دیکھتے ہی دونوں ہاتھ اُٹھا کر اُس نے نمسکار کیا۔

"دادی! آپ نیو دہلی سے آ رہی ہیں؟" ـــــ نہایت ہی احترام سے ویلایدھم نے پوچھا۔

"کون؟ ویلایدھم، کیوں رے تیری پتنی کا کیا حال ہے؟" ـــــ دادی نے مشفقانہ انداز میں سوال کیا۔

"ہاں لڑکا ہوا ہے ماں جی!"

"سکھی رہو۔ سب بھگوان کی مرضی ہے۔ یہ تیسرا ہے نا؟"

"ہاں، ماں جی!"

ویلایدھم خوشی سے پھولا جا رہا تھا۔

"تو واقعی خوش قسمت ہے۔ لیکن یاد رکھ کسی طرح انکو پڑھا لکھا دینا' سمجھا؟"

ویلایدھم چوٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرایا۔

دادی بولیں ـــــ "ارے بُدھو! ہنس کیوں رہا ہے؟ زمانہ بدلتا جا رہا ہے۔ تیرے باپ نے اور تو نے ہاتھ میں صندوقچی لئے گھومتے گھومتے اپنی زندگی بتا دی۔ لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔ سب لوگ اب بال کٹوانے کیلئے سیلون چلے جاتے ہیں۔ تجھ سے بال کٹوانے کیلئے تو مجھ جیسی بڈھی بیوائیں ہی اب باقی رہ گئی ہیں۔ زمانہ کے ساتھ انسان کو بھی بدلنا چاہیئے۔ سمجھا میری بات؟"

دادی ہنس پڑیں اور ویلایدھم جیسے اپنے ہونٹوں پر ہنسی کو چپکائے کھڑا تھا۔

"لے! جلتی دھوپ میں اِسے کھاتا جا" ـــــ کمر کی تھیلی ککڑیاں نکال کر دادی نے اُس کے ہاتھ میں دیدیں۔ "بس میں خریدی تھیں۔ ایک آنہ کی چار۔ بچوں کا خیال آیا' چار آنے کی لے لیں۔"

ویلایدھم نے پھر ہاتھ جوڑے۔ اُس وقت تک وہ وہیں کھڑا رہا جب تک دادی آگے نہیں چلی گئیں۔

دادی گوڑی اماں چدمبرم میں پیدا ہوئیں۔ عمر کے دسویں سال میں اُن کی شادی ہو گئی تھی۔ کڈلور میں وہ ایک معزز خاندان کی بہو بنی تھیں۔ ابھی زندگی کی صرف سولہ بہاریں دیکھی تھیں کہ بیوہ ہو گئیں۔ اس کے بعد اتنے سالوں سے وہ اپنے بیٹے اور پتی کے گھر کو چھوڑ کر کہیں نہ گئیں۔

گوڑی دادی کی پوتی گیتا شادی کے دس ہی مہینوں کے بعد اپنی مانگ

سے سہاگ کا سیندور پونچھ کر بیوگی کے دُکھ کا بوجھ لئے روتی ہوئی جب اُن کی گود میں آگری اور ان کے آنچل میں منہ چھپا کر رونے لگی تب گوڑی دادی نے اُس کے جانگسل غم کو اپنی زندگی کا بھاری دُکھ اور اپنی زندگی کی آخری چوٹ سمجھ کر اُسے اپنی گود میں لے لیا تھا۔ اپنی چھایا میں، اپنے پیار میں، اپنے آنسوؤں میں اور اپنی ممتا کی آغوش میں لے لینا ہی اُنھوں نے اپنا فرض سمجھا تھا۔ اب تک وہ گیتا کو اپنی پوتی سمجھ کر پیار کرتی رہی تھیں۔ لیکن جس دن مانگ کا سیندور پونچھ کر ماں کے گھر لوٹ آئی تھی اُس دن سے اپنے بیٹے پر جان نچھاور کرنے والی اُس بڑھیا نے اپنی محبت کے مرکز کو بدل دیا تھا۔ وہ مرکز اب اُس کا بیٹا نہیں اُس کی پوتی گیتا تھی۔

گوڑی دادی نے گیتا کو اپنے بیتے جیون کی جیتی جاگتی مورتی کے روپ میں دیکھا تھا۔ ہاں، گوڑی نے اپنے کو پھر گیتا میں دیکھا تھا۔

گوڑی دادی کا بیٹا گنیش اپنی بیوہ بیٹی کے مستقبل کے بارے میں سوچتے سوچتے تھک گیا تھا۔ میٹرک تک پڑھی اپنی بیٹی کو ٹیچرس ٹریننگ میں بھرتی کرانے کی تجویز بہت ہی ہچکچاتے ہوئے اُس نے دادی کے سامنے پیش کی۔ اس پر دادی نے اپنی رضامندی ہی نہیں دی اُس کی بہت تعریف بھی کی۔ گنیش ارمتحیر رہ گیا۔ جیسے وہ اپنی ماں کو سمجھ نہ پایا ہو۔ دادی دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھیں کہ اُن کی پوتی خوش نصیب ہے کہ بیسویں صدی میں پیدا ہوئی ہے۔

ٹریننگ کے بعد گیتا کئی سال کڈلور میں کام کرتی رہی۔ جب اُس کا تبادلہ نو آباد شہر نیویلی میں ہوا تو گنیش ارشش و پنج میں پڑ گیا کہ وہ کیا کرے۔ لیکن دادی نے کہہ دیا "فکر نہ کرو۔ میں گیتا کے ساتھ رہوں گی"۔ ڈھلتی عمر میں بیٹے اور خاندان کو چھوڑ کر پوتی کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئیں۔ اس کی بھی وجہ تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اُن کی چہیتی پوتی جس کی عمر ابھی تیس سال کی بھی نہیں ہوئی ہے۔ بیوگی کی گہری تاریکی میں دھنس جائے۔

چھٹی کے دنوں میں دادی اور پوتی دونوں نیویلی سے آتی رہیں۔ ہفتہ یا اتوار کو دادی اکیلی چلی آتی تھیں۔ اس کی خاص وجہ تھی۔ نائی ویلایدھم یا اس کے باپ کے سوا کسی اور کے اُسترے کے سامنے وہ اپنا سر جھکانے کی عادی نہیں تھی۔ راستے

میں ویلایدھم نے اُنھیں دیکھ لیا تھا۔ دادی جانتی تھیں کہ وہ کل سویرے صندوقچی لے کر ضرور آجائے گا۔

لگ بھگ ایک میل کی مسافت کو آدھے گھنٹے میں طے کر کے جب وہ گھر پہنچیں تو دیکھا کہ گنیش اخبار منہ پر ڈالے آرام کرسی پر لیٹا اونگھ رہا ہے۔ اس کے قریب ان کی بہو پاروتی اماں ناک کی نوک پر عینک رکھے چھاج پر پڑی چنے کی دال چن رہی تھی۔ بغل میں ٹن کا ڈبہ کھلا رکھا تھا۔ باہر کے برآمدے میں دھوپ سے بچنے کیلئے ٹٹیاں لگی تھیں۔ اُن کی چھ سالہ پوتی جانو چاروں طرف بکھرے پڑے کھلونوں کے درمیان بیٹھی اپنے آپ بولتی گنگناتی کھیل رہی تھی۔ دادی کی موجودگی پر کسی کا دھیان نہیں گیا تو اُنھیں لوہے کے چھڑوں والے دروازے کی زنجیر کو ہلانا پڑا۔ ہلکی سی آواز پر جانو نے مڑ کر دیکھا۔ منہ سے مسرت اور حیرت سے ملی جلی آواز نکلی ــــ "دادی!" ــــ اُس کی آنکھیں اور بھی بڑی ہوگئیں۔

"دروازہ کھولو!"

دادی کی آواز کان تک پہنچنے کے پہلے ہی جانو چلاتی ہوئی اندر کی طرف دوڑی۔ "اماں، اماں! دادی آگئیں!" ــــ دروازہ کھولے بغیر اُن کی آ
کی خبر دیتی ہوئی اُچھلتی کودتی پوتی کو دیکھ کر دادی مسکرائیں۔

گنیش ائر نے چہرے پر پڑے اخبار کو ہٹا کر آنکھیں کھولیں۔ بچی کی چیخ
سے اچانک نیند کے ٹوٹ جانے سے اس کی لال لال آنکھیں اِدھر اُدھر بھ
لگیں۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔

"کیوں ری شیطان! گلا پھاڑ کر چلاتی کیوں ہے؟" بچی پر بگڑتی ہوئی پارو
دروازہ کھولنے کو دوڑی آئی۔ "آیئے اتنی دھوپ میں پیدل چلی آئیں ہیں؟
گاڑی نہیں لی؟"

"گھر اتنا قریب جو ہے۔ گاڑی کیوں لیتی؟ وہ مانگے گا دس آنے
تو آٹھ آنے۔"

اندر آتی ماں کو دیکھتے ہی گنیش ائر آرام کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور بیٹی
بولا "پاروتی! ماں دھوپ میں آئی ہیں۔ ان کیلئے مٹھا لے آؤ!"

"ہوں، تم تو گہری نیند میں تھے۔ اچھا بیٹا، تھوڑی دیر سو لو!"
بیٹے کو میٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے آرام کرسی کے پاس رکھی ہوئی بینچ پر دادی
نے کمر پر کی تھیلی کو اتار کر رکھ دیا۔ آنگن میں جا کر ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھویا۔ ایک
لوٹا پانی منٹے ہوئے سر پر بھی ڈال لیا پھر آنچل سے ہاتھ منہ پونچھتے ہوئے طاق
پر رکھی بھبھوت کو اٹھا کر "ہے بھگوان، جے شمبھو! جے مہادیو!" کہتے ہوئے ماتھے
پر تلک لگایا۔

یہ آرام کرسی دادی کا تخت تھا۔ اُن کی غیر حاضری میں ہی گھر کے دوسرے
لوگ اُس پر بیٹھتے تھے۔ ہاتھ منہ دھو کر دادی آرام کرسی پر آ بیٹھیں۔ گنیش اُن پاس
ہی ایک کرسی کھینچ کر آ بیٹھا اور ہاتھ سے دادی کو پنکھا جھلنے لگا۔ جانو جھٹ سے دادی
کی گود میں آ بیٹھی۔ جیسے اسی موقعہ کی تاک میں تھی۔ گنیش نے پنکھے سے جانو کو گدگدایا۔
"اُٹھو، دادی دھوپ میں آئی ہیں۔"

"پروا نہیں بیٹا! اسے یہیں بیٹھی رہنے دو۔ آؤ میری بچی!"
دادی نے بچی کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

"اب کیسے روکو گے؟" —— زبان دکھاتی آنکھیں نچاتی جانو نے باپ
کی طرف دیکھا۔

دادی جانو کو گود میں بٹھائے بینچ پر رکھی تھیلی سے لکڑیاں نکال کر زمین پر
رکھنے لگیں۔ جانو کے ہاتھ میں ایک لکڑی دی تھیلی میں جو ساری تہہ کر کے رکھ لی
تھی اُسے الگنی پر ڈالنے کیلئے الگ رکھ دیا۔ پھر تھیلی انڈیل دی۔ اب اُس میں
سے چنے نیچے گرے۔ تقریباً تین سیر ہوں گے۔ ایک لفافہ بھی گرا۔
"بینا اور آبھی کہاں ہیں؟" چاروں طرف نظریں دوڑاتی ہوئی دادی
نے لفافہ بیٹے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لو، گیتا نے یہ تمہارے ہاتھ میں دینے کو کہا ہے۔" گنیش اندر دل میں ڈرتا
رہا کہ ماں کہیں یہ نہ پوچھ بیٹھے کہ بیس سال کی سیانی بیٹی بینا کو اُس کے چھوٹے بھائی
آبھی کے ساتھ میٹنی شو میں بھیجنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ اس لئے بالکل ہلکی آواز
میں بولا "بینا کا پڑھا ہوا ایک ناول سینما بن کر آیا ہے۔ دونوں شیطانوں نے

تو میری ناک میں دم ہی کر دیا۔ مٹیٹی شو ہے۔ یہی سوچ کر انھیں بھیجا ہے۔"

"او ہو! قسط وار جو ناول اخبار میں آیا تھا وہی ناول ہے نا؟ میں نے بھی دیکھا تھا۔" دادی نے اخبار اور مصنف کا نام بتا کر پوچھا کہ یہ فلم وہی ہے کیا؟۔ پھر بولیں۔ "اتنی سی بات پر بچوں کو شیطان کیوں کہتے ہو۔ تم اور میں بھلے ہی نہ جانتے ہوں کہ آج کے فلمی ستارے کون کون ہیں لیکن بیٹا' یہ جان رکھو کہ ہمارے گھر کے بچے بہت اچھے ہیں۔"

لمحہ بھر چپ رہ کر دادی نے پوچھا۔ "خط میں کیا لکھا ہے اُس نے؟ میرے پوچھنے پر اس نے کہا تھا پتا جی بتا دیں گے۔"

لفافہ کھول کر عینک چڑھا کر ایک صفحہ کے اُس خط کے الفاظ پر نظریں دوڑاتے ہوئے گنیش اُد کے ہاتھ کانپنے لگے۔ سارا چہرہ پسینہ سے تر ہو گیا۔ ہونٹ کانپ اُٹھے۔ پورا خط پڑھنے کے بعد خالی نظروں سے سامنے کی دیوار پر لگی گیتا کی شادی کی تصویر کو وہ دیکھتا رہ گیا۔ اس کا چہرہ یکدم اس کے قلبی جذبات کا آئنہ بن گیا۔ کرسی کا دستہ پکڑ کر ماں کی طرف پتھرائی آنکھوں سے اس نے دیکھا۔ خط ہاتھ سے پھسل کر فرش پر گر گیا۔

"ہائے بھگوان! یہ کیا؟" —— دادی کا دل دھک سے رہ گیا۔ فرش پر گرے ہوئے خط کو اُٹھا کر روشنی میں لے جا کر پڑھنے لگیں۔ ابھی تک عینک کے بغیر ہی وہ پڑھ سکتی تھیں۔ لکھا تھا۔

"پیارے پتا جی اماں اور دادی کو پرنام! چھ مہینے تک سوچنے کے بعد یہ خط سچے دل سے لکھ رہی ہوں۔ اس خط کے بعد شاید ہمارے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ بند ہو جائے۔ ہمارا رشتہ بھی ٹوٹ جائے۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی لکھ رہی ہوں۔ اپنے ساتھ کام کرنے والے ہندی ماسٹر شری رامچندر کے ساتھ اگلے اتوار کو سول میرج کرنے کا میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میں بیوہ ہوں۔ پچھلے چھ مہینے سے میں سوچ میں رہی کہ یہ پاپ ہے یا میں نے صحیح قدم اُٹھایا ہے۔ بہت سوچنے کے بعد ہی میں اس فیصلہ پر پہنچی ہوں۔ دل میں مچلتے جذبات کو ایکدم سرد کر کے بیوگی سے وابستہ فرائض کا تمام تر احترام کرنے میں اپنے آپ کو ناقابل

پاکر، دنیا کو دکھانے کیلئے اپنی شخصیت پر ایک جھوٹا نقاب ڈالے رہنا یہ مجھے اچھا نہیں ہوا۔ آج میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ بہت صحیح فیصلہ ہے۔ یہ میں سچے دل سے محسوس کرتی ہوں۔

"میرا یہ فیصلہ میری حالت اور نئے زمانہ کے تقاضوں کے پیشِ نظر مجھے بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس فیصلہ پر مجھے کوئی ذہنی کوفت نہیں ہو رہی ہے نہ آپ سے معافی ہی مانگنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ پھر بھی یہ بات میرے دل کو کچوکے لگا رہی ہے کہ اب شاید مجھے آپ لوگوں کے پیار اور شفقت سے محروم ہونا پڑے گا۔ پھر بھی ایک نئی زندگی اور نئی روشنی سے میں وابستہ رہوں گی۔ یہی خیال میرا حوصلہ بندھا رہا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ زمانے کی رفتار کے ساتھ کس کا دل کتنا بدل گیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ میرے اس فیصلہ سے متفق ہوں۔ ابھی ایک ہفتہ کا وقت ہے۔ اگر آپ متفق ہوں تو میرے لئے بہت بڑی خوش نصیبی ہوگی۔ نہیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی گیتا مر گئی! ہاں، میرا یہ فیصلہ میرے ذاتی مفاد سے وابستہ ہے۔ دادی کے سوا اور کس نے میرے لئے کچھ کیا ہے؟ اور کیوں میں کسی سے تیاگ کی امید رکھوں؟۔

آپکی چہیتی گیتا۔"

"بیٹا، یہ سب کیا ہو گیا ہے؟" ——— دادی کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔ وہ بھونچکی سی پتھر کی مورتی کی طرح بیٹھی رہیں۔

"ہمارے لئے وہ مر گئی!" ——— کٹھور آواز میں گنیش اُٹھ بول اُٹھا۔

دادی سناٹے میں آگئیں۔ گیتا نے پہلی بار ماں کی صلاح و مشورہ اور اجازت کے بغیر اتنا اہم فیصلہ کیا تھا۔ دادی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اُنھوں نے اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر پوچھا ——— "یہ کیا کہہ رہے ہو بیٹا؟"۔

"اور کیا کہوں ماں؟ جس گھرانہ میں تم جیسی دیوی کا جنم ہوا اُسی گھرانہ میں۔
——— ہائے ایشور!" ——— گنیش اُٹھ درد اور غم سے تلملا اُٹھا۔

"میرا زمانہ کچھ اور تھا بیٹا!" یکایک یہ الفاظ دادی کے منہ سے نکل گئے۔ اسی لمحہ اتنے لمبے زمانہ کے بعد دادی کو یکایک ایک سچائی کا علم ہوا۔ اُنھوں نے

سوچا میرا بیٹا میری بات سننے کیلئے منتظر کھڑا ہے صرف ماں کی محبت سے نہیں بلکہ اس لئے کہ میں ایک زمانہ کی نمائندہ ہوں۔ ایک نشان ہوں۔ وہ زمانہ رسم ورواج کا کا زمانہ تھا۔ مذہب کے اُصولوں پر کڑی پابندی کے ساتھ عمل پیرا ہونے کا زمانہ تھا۔ شاستر کے اصولوں پر چلنے والے قدامت پسند خاندان میں میرا جنم ہوا۔ بیٹا یہی چاہتا تھا کہ اُس کا خاندان بھی اُسی نسل کی پیروی کرے۔ یہ سوچتی ہوئی بڑھیا چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اپنے بیٹے کے سنگین فیصلہ پر اپنی چہیتی پوتی گیتا کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتی ہوئی دادی کچھ بھی نہیں کہہ پائیں۔

"پاروتی نے بھی خط اُٹھا کر پڑھا۔" اری کلموہی! میرے سر پہ آگ لگا دی تونے!!" بلکتی ہوئی وہ رونے لگی۔

دادی نے اپنی جبلّی مستقل مزاجی کے ساتھ اس خط کو ہاتھ میں لے کر آخری فقروں پر نظر ڈالی ــــ میرا یہ فیصلہ میرے ذاتی مفاد سے وابستہ ہے۔ دادی کے سوا اور کس نے میرے لئے کچھ کیا ہے اور کیوں میں کسی سے تیاگ کی امید رکھوں؟" دادی کے دل میں یہ الفاظ تیر کی طرح پیوست ہو گئے۔ اُنھوں نے اپنے ہونٹ کاٹ لئے۔ ان الفاظ کا مفہوم کوئی سمجھ نہیں پائے گا! صرف دادی ہی سمجھتی ہیں۔ عمر کی اٹھارویں سال میں گیتا بیوہ ہو گئی تھی۔ بالوں میں پھول سجا ماتھے پر تلک لگانا اس نے چھوڑ دیا لیکن اُس کے ماں اور باپ کس کو بھولے تھے؟ گیتا کی یہی قسمت ہے اُس کی بدبختی ہے۔ یہ سمجھ کر اس بیچاری کی ناگفتہ بہ حالت اور اس کے بے انتہا دُکھ کو سبھی بھلا بیٹھے تھے۔ گیتا کے پیدا ہونے کے بعد بھی پاروتی پھر ماں بنی تھی۔ آبی اور جانو کو اُس نے جنم دیا تھا۔ زندہ رہنے کی خواہش لئے جینے والوں کا ردِّ عمل یہی ہے۔ یہی زندگی ہے، لیکن؟ گیتا سے بھی کم عمر میں آج سے پچاس سال پہلے کے سماج میں بیوگی کی بے رحم اور ظالم آگ میں جو جلی سی لٹی سی رہ گئی تھیں۔ جنھوں نے اپنے دل کے رنگین تصورات اور ماضی کی حسین یادوں کو یکایک نکال پھینکا تھا، اپنے دل کی امنگوں اور ارمانوں کو بیرحمی کے ساتھ کچل دیا تھا۔ وہ بوڑھی دادی آج اپنی پوتی کے دل کے والہانہ جذبہ کو سمجھے بغیر کیسے رہتیں؟ اسی لئے تو دادی گنیش ائیر اور

پاروتی کی طرح گیتا کو بددعا نہ دے سکیں۔ کسی کو بھی گالیاں دینا دھتکارنا اُن کا کام نہ تھا۔ وہ تو نفرت بھی نہ کر سکتی تھیں۔ حالانکہ اُن کا دل درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

شام کو مینا اور آبھی میٹنی شو سے لوٹے۔ دہلیز پر پاؤں رکھتے ہی ابھی کی نظریں آرام کرسی پر لیٹی دادی پر پڑیں۔ آبھی یکایک رک گیا اور پیچھے کی طرف مڑ کر اُس نے مینا سے کہا "دادی ہیں ری!"

"ہاں! اندر ہیں یا ہال میں؟" مینا کے قدم آگے نہ بڑھے۔

"اپنے سنگھاسن پر براجمان ہیں! سو رہی ہیں"

مینا نے شانے پر جھولتے آنچل کو اُٹھا کر سیدھا کیا اور رتھ لگا کر سمیٹ لیا۔ پھر آنچل سے کھلی پشت کو اچھی طرح ڈھانپ کر کمر میں اڑس لیا۔ ایک بار اپنی طرف دیکھ لیا کہ سب ٹھیک ہے یا نہیں۔ اس کے بعد سر جھکائے گھر میں آئی۔ اندر آنے پر معلوم ہوا کہ دادی سو نہیں رہیں۔ اُس کے پتا ایک طرف کرسی پر سر لٹکائے بیٹھے تھے۔ ماں آنچل سے منہ ڈھانپ کر سسکتی ہوئی ایک طرف پڑی تھی۔ یہ دیکھ کر آبھی اور مینا حیران سے رہ گئے۔ گھر میں نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟

جانو ہنستی ہوئی دوڑی آئی "دیکھو! دادی لکڑیاں لائی ہیں!"

آواز سن کر دادی نے مڑ کر دیکھا۔ مینا کھڑی تھی۔

"دادی کب آئیں تم؟ یہ سب کیا ہے؟"

دادی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

سامنے کھڑی مینا کو آنکھ بھر کر دیکھنے کے بعد دادی یہ سوچنے کیلئے مجبور ہو گئیں کہ بیٹے نے گیتا کو مری ہوئی کیوں سمجھ لیا۔ پاروتی نے مشتعل ہو کر اُسے بددعا کیوں دی؟ بیٹے اور بہو کے غصّہ میں جو بے انصافی تھی وہ اُنھیں صاف دکھائی دی۔

مینا نے خط اُٹھا کر پڑھا۔ دادی نے اُسے منع کرنا چاہا پھر سوچا۔ پڑھ لے تو اچھا ہی ہے۔ اُن کی نظریں مینا کے چہرہ پر جمی رہیں۔ مینا کے چہرے پر نفرت کی لکیریں اُبھر آئیں۔ "ہائے ری بے شرم!" اُس کے پیچھے کھڑے ہو کر

ابھی بھی خط پڑھ رہا تھا اور ایسی رونی صورت بنا رکھی تھی جیسے تلخ گھونٹ حلق کے نیچے اتار رہا ہو!۔

گھر میں گہرا سناٹا چھایا تھا۔ اس طرح سب ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ رہے تھے جیسے گھر میں پلیگ کا چوہا نظر آ گیا ہو! سب کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس دن رات کو گوڑی دادی نے کچھ نہیں کھایا۔ اپنی آرام کرسی سے اُٹھیں بھی نہیں۔ بیٹے اور بہو پوتے اور پوتی کو پھٹی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی دل ہی دل میں گیتا کے بارے میں سوچتی ہوئی پڑی تھیں۔ اُن کے خیالات نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتے رہے تھے۔ ہائے گیتا! تم کبھی بس اسٹینڈ پہ نہیں گئیں لیکن اُس دن میرے ساتھ مجھے رخصت کرنے کیلئے آئی تھیں۔ جب بس چلی تو آنچل سے تم نے آنکھیں پونچھ لی تھیں۔ میں سمجھی تھی کہ دھول پڑ گئی ہو گی تمھاری آنکھوں میں۔ گیتا، میری بیٹی، یہ کیا کر بیٹھی ہو تم؟ دادی نے جیسے اتنی دور سے اپنی پوتی سے پوچھا۔

پو پھٹنے کے پہلے ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔ جب اُن کی آنکھیں کھلیں "مایا" کا دروازہ کھل چکا تھا۔ دروازے کے قریب لوہے کے چھڑوں کے پاس ہاتھ میں منہ دھوتی لئے نائی دیلا بدھم کھڑا تھا۔

ساری باتیں خواب بن جاتیں تو کتنا اچھا ہوتا ـــــ دادی نے سوچا لیکن میز پہ پڑا ہوا وہ خط بتا رہا تھا کہ نہیں یہ خواب نہیں یہ سچ ہے! دادی نے جھک کر خط کو ہاتھ میں اُٹھایا اور پورا خط پھر ایکبار ایک ہی سانس میں پڑھ گئیں۔

گنیش اندر کمرے میں آیا اور غم میں گھلتی ہوئی ماں کو دیکھ کر دلجوئی کرنے کی غرض سے بولا۔ "ماں دروازے پر دیلا بدھم کھڑا ہے۔ اُٹھو غسل کر لو۔ سمجھ لو کہ گیتا مر گئی!"

دادی آگ بگولا ہو گئیں۔ "بند کرو اپنی زبان!" وہ تن کر کھڑی ہو گئیں "صبح صبح کیسی منحوس بات منہ سے نکالتے ہو بیٹا؟ ایسا کیا ہو گیا ہے کہ اُسے مرنے کیلئے کہتے ہو؟" دادی اپنے غصہ پر قابو نہ پا سکیں۔ اُن کا سارا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ پھر وہ سسک سسک کر رو پڑیں اور روتی ہی رہیں۔

کچھ دیر بعد اپنی سرخ سرخ آنکھیں کھول کر اُنھوں نے زور سے پوچھا۔ "کون سا پاپ کر دیا گیتا نے؟"

ماں کو مشتعل دیکھ کر گنیش ائیر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ بھی چلا اُٹھا —— "کون سا پاپ؟ ماں! تم بھی پوچھ رہی ہو؟ تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟"

دوسرے لمحہ دادی نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اپنی فطری مستقل مزاجی کے ساتھ بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ خاموش کھڑی رہیں جیسے کچھ سوچ رہی ہوں اُن کا بیٹا آج پہلی بار اُن سے تن کر بول رہا تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد دھیمی لیکن پر استقلال آواز میں بولیں۔ "ہاں بیٹا، میں پاگل ہو گئی ہوں۔ لیکن میرا یہ پاگل پن آج کا نہیں ہے۔ یہ میرا بہت دنوں پرانا روگ ہے۔ اس کا علاج نہیں۔ میرا پاگل پن تو میرے ساتھ ہی جائے گا۔ لیکن گیتا کا پاگل پن یکا یک ظاہر ہو گیا ہے اس کیلئے کیسے دوش دیتے ہو تم؟ اُس نے تو صاف کہہ دیا ہے نا کہ میرا فیصلہ میری نظر میں بالکل درست ہے۔"

گنیش ائیر نے بیچ میں ٹوکا —— "صاف کہہ دینے سے اس کا فیصلہ درست ہو جائے گا؟"

"وہ تو کہتی ہے اُس کا فیصلہ اس کی نظر میں بالکل درست ہے کہو تم کیا کہتے ہو؟" دادی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"چڑیل کہیں کی! اتنے باعزت خاندان کا نام مٹی میں ملا دیا۔ اسی لئے کہتا ہوں ماں سمجھ لو کہ وہ پاپن مر گئی!" —— گنیش ائیر چلا اُٹھا۔

دادی نے پل بھر اپنے سامنے کھڑے بیٹے کو اس طرح دیکھا جیسے کسی اجنبی آدمی کو دیکھ رہی ہوں۔ پھر ایک مغموم ہنسی کے ساتھ بولیں۔"

ہمارے اصول —— بیٹا تب تو تمھیں کیا کرنا چاہیے تھا یہ جانتے ہو؟ ان اصولوں نے میری کیا گت بنائی یہ جانتے ہو؟ تم کیسے جانتے تم تو اس وقت دودھ پیتے بچے تھے۔ میری عمر اُس وقت پندرہ سال کی تھی بیٹا تم اُس وقت میری صورت دیکھتے تو خوفزدہ ہو کر چلا اُٹھتے جیسے میں کوئی بھوت پریت ہوں۔ بچہ ماں کا دودھ پینے سے ڈرتا تھا۔ میری ایسی بھیانک صورت بنا کر لوگوں

سنے مجھے گھر کے ایک کونے میں بٹھا دیا تھا۔ تم نے اپنی بیٹی کی ویسی درگت کیوں نہ بنائی؟ کہو، کیوں نہ وہ سب کچھ کیا تم نے؟ ---------------

دادی کی آنکھوں سے آنسو کی دھارا بہہ رہی تھی۔ کچھ دیر چپ رہ کر بولیں۔ "ممتھا ــــ اصولوں نے اُسے رنگین ساریاں پہننے کی اجازت دی تھی کیا؟ بال سنوار کر جوڑا بنا کر اسکول اور کالج جانے کو کہا تھا کیا؟ اپنا پیٹ بھرنے کی خاطر خود اُسے کمانے پر مجبور کیا تھا؟ تم نے ان سب باتوں کیلئے میری اجازت مانگی تو میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں نے کیوں منع نہیں کیا تھا۔ یہ جانتے ہو؟ سوچا تھا کہ زمانہ بدل رہا ہے تو انسان کو بھی بدلنا ہے۔" ــــ دادی لمبی آہ بھرتی ہوئی بولیں ــــ "میرے لئے تم تھے، گھر بار تھا، دولت تھی۔ پھر زمانہ بھی اُسی طرح کا تھا۔ آج گیتا جو کر بیٹھی ہے اس کا تصور تک اس زمانہ میں نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن آج دنیا بدل گئی ہے۔ زمانہ بدل گیا بیٹا! تمھارا حال میں جانتی ہوں۔ مجھ سے کوئی بات چھپی نہیں ہے۔ تم بال بچے والے ہو کل ان کی بھی شادی ہوگی۔ یہ سب میں جانتی ہوں۔ لیکن اب بتاؤ کیا تمھارا اصول گیتا کو زندگی دے سکے گا؟ گنیش، مجھے معاف کر دے بیٹا! مجھے اپنی وہ بٹیا چاہئے۔ مجھے اپنی گیتا چاہئے بیٹا! میری زندگی میں اور کیا رکھا ہے؟ میرا اصول میرے ساتھ رہے گا۔ میرے جسم کے ساتھ جل بھن کر وہ خاک ہو جائے گا۔ تم لوگ سکھی رہو۔ میں چلی جاوں گی اس کے پاس۔ میں گیتا کے پاس چلی جاوں گی۔ سوچ کر دیکھو تمھارا دل مان جائے تو اچھا، نہیں تو بیٹا سمجھ لینا گیتا کے ساتھ میں بھی مر گئی! اچھا میں چلی!"

دادی نے انگلی سے اپنی ساری اُتار تھیلی میں رکھ لی۔

"ماں! ــــ ماں!!"

ہاتھ جوڑتے ہوئے گنیش سسک سسک کر رونے لگا۔

"کیوں روتے ہو بیٹا؟ خوب سوچ سمجھ کر میں اس فیصلہ پر پہنچی ہوں۔ آخر وہ بھی ہماری ہی بیٹی ہے نا؟" ــــ دادی کا گلا بھر آیا۔ بہو کی طرف دیکھ کر بولیں "پاروتی! ہوشیاری سے گھر بار سنبھالنا۔ گنیش کا بھی خیال رکھنا!"

دادی نے سب سے رخصتی لی۔

"گیتا کے پاس مجھے ابھی جانا ہے!"۔ یہ کہتے ہوئی دروازے کی طرف گھومیں تو دیکھا کہ نائی دیلا یدھم دروازہ پر کھڑا ہے۔

"تو جا، مجھے ابھی اسی وقت یتولی جانا ہے!"

پچیس پیسے اُس کے ہاتھ پر رکھ کر دادی نے اُسے واپس کر دیا۔

آئندہ سے اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہوں، دنیا ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ میں کیا ایک نائی کو بھی نہیں بدل سکتی؟ دل ہی دل میں سوچتی اور ہنستی ہوئی دادی نے تھیلی اُٹھالی۔ آنگن پار کرتے ہوئے ایک بار مڑ کر دیکھا اور پھر باہر چلی گئیں۔

صبح کی ہلکی دھوپ میں دھول میں پیروں کو جماتی ہوئی ہلتی ڈلتی جو بوڑھی دادی آرہی ہیں وہ ایسی معلوم ہو رہی ہیں جیسے برق رفتاری سے دھول اُڑا کر آتے ہوئے نئے زمانہ کا خیر مقدم کرنے کے مقصد سے گذرتے ہوئے زمانہ کا نشان بنی دادی نہایت اطمینان سے دھیرے دھیرے قدم بڑھا رہی ہیں۔۔۔!

ہاں، یہ آج اور کل کا سنگم ہے! ــــــ دو زمانوں کا سنگم!!

شمع ظفر مہدی۔ ایم۔ اے



آج جب میں اپنے وطن واپس آئی ہوں
جی چاہتا ہے یہاں کی ہر چیز سمیٹ کر د
دل میں چھپا لوں۔ اس سرزمین سے مجھے کتنا کہرا
ہے ۔ یہ جانے پہچانے راستے' یہاں کی فضا کی مانو
خوشبو' کامنی کی جھاڑیاں ..... سب کچھ ویسا
تو ہے ۔ ڈرائنگ روم میں تیز دھن کا کوئی ریکار
رہا ہے ۔ چھوٹے بھائی بہن اسی طرح شور مچا
میں آہستہ سے اپنے کمرے میں داخل ہو
سامان ادھر اُدھر بکھرا پڑا تھا۔ دیواروں پر لگ
گرآلود تھیں۔ دریچے کے قریب ایک تصویر
جاکر میں رک گئی۔ گرد کی دبیز تہہ کے پیچھے
کا شریر چہرہ مسکرا رہا تھا۔

دل میں درد کی ایک لہر سی اٹھی۔ بے اختیار ہاتھ بڑھا کر تصویر اُتار لی۔ اپنے آنچل سے گرد صاف کرنے لگی۔ شیشہ چمک اُٹھا۔ بھیّا کی مسکراہٹ جیسے اور نکھر گئی۔ ان کی ہنستی ہوئی آنکھوں نے مجھ سے پوچھا۔ "بہنو اپنے بھیا کو چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھیں"۔ اور میری آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسوؤں سے تصویر کا شیشہ دھندلا گیا ..... ان آنسوؤں میں کتنی یادیں چمک اٹھی تھیں۔

بھیّا ہنستے ہوئے یونی ورسٹی سے آئے ہیں۔ پتہ چلا ہاکی میچ میں ان کی ٹیم جیت گئی۔ بھیّا سب سے اچھا کھیلتے ہیں۔ انھیں انعام ملا ہے۔ ہم سب اس

خوشی میں پکچر جانے کی ضد کر رہے ہیں اور بھیا نے شرط لگا دی ہے۔ سب شرط سُننے کو بے قرار ہیں۔ بھیا نے کہا اپنی مہر آپا کو بھی لے چلو تب پکچر لے جائیں گے۔ اوہ یہ کیا مشکل بات ہے۔ میں برابر کی کوٹھی میں دوڑ گئی۔ مہر آپا اپنے کمرے میں اسٹڈی کر رہی تھیں۔ ہاتھ پکڑ کر لے آئی۔۔۔۔۔

مہر آپا باجی کی سہیلی تھیں۔ بھیا سے ان کی بہت بنتی تھی۔ ان دنوں ایف۔ اے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اکثر بھیا سے انگریزی کی نظمیں پڑھنے آیا کرتی تھیں۔ صورت ایسی من موہنی تھی کہ ہر کوئی ان کو پیار کرتا۔ ہم بچوں کو ان سے ایسی اُنسیت تھی کہ ایک دن نہ دیکھتے تو اداس ہو جاتے۔ بھیا کی تو بات الگ تھی۔

بھیا ایم۔ اے میں تھے اور ان کی شخصیت اتنی خوب صورت اور نمایاں تھی کہ ہم سب ان پر ناز کرتے تھے۔ ان کی چیزوں، ان کی عادتوں تک سے ہم مانوس تھے۔ بھیا کو صبح صبح نہانے کی عادت تھی۔ اور ہمیں صبح کی ہلکی نیند میں پانی گرنے کی آواز کے ساتھ ان کی گنگناہٹ سننے کی عادت تھی۔ اگر کہیں بھیا دو چار دنوں کو بھی چلے جاتے تو سب کے چہرے اُتر جاتے۔

چاندنی راتوں میں ہم سب دریا کی سیر کو جایا کرتے تھے۔ وہاں خوب بھاگ دوڑ کے کھیل ہوتے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت تلوؤں میں لگتی تو مزا آجاتا۔ بھیا کو بوٹنگ کا شوق تھا۔ جھل مل کرتی لہروں میں کشتی لیے، چلے جا رہے ان کے سڈول، ترشے ہوئے سفید بازو چاندنی میں کشتی چلاتے ہوئے بے حد پیارے لگتے۔۔۔۔ کیسی کہانیوں جیسی راتیں تھیں۔ مہر آپا کشتی میں بیٹھی ہوتیں تو دور سے ان کا نکھرا اتنا حسین معلوم ہوتا جیسے چاند بھیا کی کشتی میں اُتر آیا ہو۔

ایک بار کوئی چھٹیاں پڑیں۔ بھیا کی تجویز پر ایک ڈرامہ اسٹیج کیا گیا۔ چھوٹا سا ٹیبلو تھا جس میں بھیا یونانی دیوتا "اپالو" بنے تھے اور مہر آپا اس ڈرامہ کی ہیروئن تھیں۔ ایسا پیارا، اتنا کامیاب ڈرامہ پھر کبھی نہ ہو سکا۔ ڈرامے کے بعد میک اپ اُتارے بغیر وہ دونوں ساتھ ساتھ باغ کی روشوں پر سے گذر رہے تھے۔ میں نے دور سے انھیں دیکھا۔ دونوں اتنے پیارے لگ رہے تھے کہ میں نے بے اختیار دعا مانگی تھی۔ "اے خدا! یہ ہمیشہ اسی طرح

ساتھ رہیں۔
امتحان کا زمانہ قریب تھا۔ بھیا کو لو لگ گئی۔ گھر بھر پریشان تھا۔ دوسری صبح کالج جاتے وقت مہر آپا ہمارے گھر آئیں تو کسی نے ان کو بھیا کے بارے میں بتایا۔ ان کا شاداب چہرہ کیسا پریشان ہو گیا تھا۔ میرے ساتھ بھیا کے کمرے میں آئیں .... دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ... مہر آپا اپنی روشن پیشانی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے باجی سے بولیں۔ میرے سر میں درد ہے، میں آج کالج نہیں جاؤں گی .... باجی مسکرا کر چلی گئیں ....
اور مہر آپا دن بھر ہمارے گھر رہی تھیں۔ کیسی بے چین تھیں۔ بھیا بخار میں غافل ہو جاتے تھے، اپنے نرم گلابی آنچل سے ان کے ماتھے کا پسینہ خشک کرتیں، گھڑی دیکھ کر دوا دیتیں .... بار بار ٹمپریچر لیتیں۔ شام تک بھیا کا بخار کم ہو گیا۔
ایک بے حد سرد شام تھی۔ آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا تھا۔ برفیلی ہوائیں چل رہی تھیں۔ ہم سب آتش دان کے گرد بیٹھے باجی سے پریوں کی کہانیاں سن رہے تھے، بھیا آ گئے .... مجھ سے بولے۔ جاؤ اپنی مہر آپا کو بھی لے آؤ۔ وہ اس وقت بہت اُداس ہیں۔
میں حیران سی چپ چاپ اُٹھ کر چلی گئی۔ راستے بھر سوچتی رہی۔ بھلا بھیا کو یہاں بیٹھے بیٹھے کیسے خبر ہو گئی کہ وہ اُداس ہیں۔ وہاں پہونچی تو مہر آپا سچ مچ اُداس تھیں۔ گھر میں کسی سے کچھ بحث وغیرہ ہو گئی تھی۔ میں انھیں ساتھ لے آئی۔ بھیا بھی ہمارے ساتھ آ کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے اتنے مزیدار قصے سنائے کہ سب ہنس پڑے۔
اور ایک بار مہر آپا اپنے کسی عزیز کے یہاں دوسرے شہر چلی گئی تھیں۔ ان کی کمی سب محسوس کرتے لیکن بھیا بہت اداس رہتے تھے۔ جس دن وہ آنے والی تھیں بھیا کا موڈ ایک دم اچھا ہو گیا۔ ہلکی سردیاں تھیں لیکن انھوں نے اپنا نیوی بلو بلیزر پہنا۔ بعد میں پتہ چلا مہر آپا کو پسند تھا۔ بھیا گیٹ پر ٹہلتے رہے۔ مہر آپا آ گئی تھیں۔ ہم سے ملنے تھوڑی دیر بعد آئیں۔ ان کا رنگ اور نکھر آیا تھا۔

ہونٹ یاقوت کی طرح سرخ ہو رہے تھے۔ ہلکے نیلے لباس میں بہت ہی جچ رہی تھیں۔ آکر باجی کے پاس بیٹھ گئیں . . . . کچھ دیر بعد بھیا گنگناتے ہوئے لاپروا ہی سے کمرے میں آئے۔ مہر آپا کو دیکھ کر ایسا چونکے جیسے انھیں ان کی آمد کی خبر نہ رہی ہو۔ مجھے بھیا کے اس طرح انجان بننے پر بڑا پیار آیا۔ مہر آپا باجی سے باتیں کر رہی تھیں۔ بھیا دور بیٹھے انھیں دیکھتے رہے یہاں تک کہ مہر آپا کا چہرہ کانوں کی لوؤں تک گلابی ہو گیا۔ وہ ایک دم خاموش ہو گئیں۔ ان کی آنکھیں بہت دیر تک جھکی جھکی رہیں۔

چائے آئی۔ کسی نے مہر آپا کی پیالی میں چینی زیادہ ڈال دی تھی۔ تھوڑی سی پی کر رک گئیں۔ مجھ سے بولیں۔ اس میں رنگ اور ملا لاؤ . . . . میں ان کی پیالی لے کر اٹھی ہی تھی کہ بھیا نے میرے ہاتھ سے لے لی اور اس میں کی تھوڑی سی چائے اپنی پیالی میں ڈال کر یوں پینے لگے جیسے یہ کوئی خاص چائے تھی۔

اور ایک بار وہ صبح صبح ہمارے گھر آئیں۔ انھوں نے پیازی ریشم کا بے حد حسین لباس پہن رکھا تھا۔ کانوں میں ستاروں جیسے آویزے جگمگا رہے تھے۔ پتہ چلا آج ان کے کالج میں کوئی فنکشن ہے۔ کچھ دیر بعد وہ چلی گئیں۔ بھیا نہ جانے کہاں تھے۔ جب آئے تو ہم نے انھیں بتایا کہ آج مہر آپا اتنی سوئیٹ لگ رہی ہیں۔ دل چاہتا ہے دیکھتے ہی رہیں . . . . بھیا مسکرائے۔ بولے۔ چلو پھر بلا کر دیکھا جائے۔

ہاں اب وہ ضرور آئینگی۔ ان کے کالج میں کوئی فنکشن ہے۔

بھیا اس بات پر یوں ہنس دئے جیسے یہ کوئی ناممکن بات ہے ہم انھیں فون کرنے گئے۔ پہلے ان کی پرنسپل نے فون اٹھایا، ان کی بھاری درشت آواز سُن کر بھیا نے گھبرا کر فون مجھے دے دیا۔ میں نے بتایا مہر انجم سے ملنا ہے۔ میں ان کی چھوٹی بہن بول رہی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد فون پر وہی مخصوص میٹھی آواز سنائی دی۔ "کون ہے بھئی؟"

میں نے نام بتایا۔ ہلکی ہنسی کے ساتھ انھوں نے پوچھا "کیا بات ہے ڈیئر؟" میں نے فون بھیا کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ بڑی دیر تک خاموش

رہے، ادھر سے شائد مہر آپا نے پھر کچھ پوچھا ... بھیا بولے میں نجمی بول رہا ہوں ... چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر ان کی مدھم آواز آئی ..... "آجاؤ" بھیا نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ ہم دونوں میں شرط لگ گئی۔ میں کہہ رہی تھی۔ کیوں آئینگی بھلا۔ کوئی وجہ بھی ہے، آپ نے ٹھیک سے کچھ کہا ہی نہیں۔ اور بھیا مسکراتے رہے ..... مشکل سے بیس منٹ گذرے ہوں گے گیلری میں مخصوص قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ بھیا نے میری طرف دیکھا۔ میں باوجود ہار جانے کے مسرور ہو گئی۔ دروازہ کا سبز پردہ ہٹا اور جیسے کمرے میں چاندنی چھٹک گئی۔ اس وقت وہ صبح سے بھی زیادہ پیاری لگ رہی تھیں۔ شائد ان کی سہیلیوں نے ان کی کلائیوں پر سفید پھولوں کے گجرے باندھ دیئے تھے۔ ماتھے پر ہلکا ہلکا پسینہ موتیوں کی طرح چمک رہا تھا۔

انھوں نے اپنے اس طرح بلائے جانے پر کچھ بھی تو نہ پوچھا۔ سامنے بیٹھ گئیں۔ میں نے چاکلیٹ پیش کئے۔ اپنے شرط ہارنے کے بارے میں بتایا تو وہ بھیا کی طرف دیکھنے لگیں۔ پھر ہم تینوں ہنس دیے۔ بھیا نے اس وقت کتنے اچھے اچھے اشعار سنائے تھے، ایک غزل ترنم سے سنائی۔ ہم مسحور سنتے رہے۔ نجانے کتنا وقت بیت گیا۔

ایک شام سب لان پر بیڈمنٹن کھیل رہے تھے اچانک مہر آپا کی چوڑی ٹوٹ کر کلائی میں چبھ گئی۔ ڈھیر سا خون نکلا۔ سب کھیل چھوڑ چھاڑ کر سبزے پر آبیٹھے۔ باجی نے بھیگے کپڑے سے زخم دھویا۔ اب ان کی سیمیں کلائی پر صرف دو سرخ لکیریں چمک رہی تھیں۔ لیکن شاید انھیں تکلیف ہو رہی تھی بار بار دوسرے ہاتھ سے زخمی کلائی دبانے لگتی تھیں۔

بھیا بولے "ادھر لاؤ اپنا ہاتھ، ہم ابھی درد کم کئے دیتے ہیں"۔ ہم سمجھے کوئی دوا لگائیں گے۔ مہر آپا نے جھجکتے ہوئے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا، وہ بڑی دیر تک کلائی تھامے بس اسے دیکھتے رہے، پھر ایک دم جھکے، آہستہ سے زخم کو چوم لیا۔ مہر آپا نے ہاتھ جھٹک لیا۔ ہم سب بھیا کی اس شوخ حرکت پر زور سے ہنس دیے۔ کچھ دیر بعد میں نے مہر آپا سے پوچھا

کلائی کا درد سچ مچ کم ہو گیا تھا۔ پھر یہ زخموں کو چومنے کی بات کتنی چلی تھی۔ ذرا کہیں کسی کے چوٹ لگی یا پنسل بنانے میں انگلی کٹ گئی اور بھاگے بھیا یا مہر آپا کے پاس۔ . . . چومئے جلدی ۔۔ اُنوہ بھئی بڑا درد ہو رہا ہے، چوم لیجئے نا . . .
وہ دونوں ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھتے۔ ہمارے ننھے مُنے زخموں کو چوم لیتے۔ پتہ نہیں یہ ہمارا اعتقاد تھا یا سچ مچ کوئی بات تھی، درد فوراً گم ہو جاتا۔ ہم یہ ترکیب اوروں کو بھی بتاتے۔ سب کو بڑا تعجب ہوتا۔

ایک رات سب چمن میں فوارے کے گرد بیٹھے تھے، ہلکی ہلکی چاندنی تھی، کامنی کے پھول چاروں طرف مہک رہے تھے۔ بھیا مہر آپا کو اپنا کوئی خواب سنا رہے تھے، ہم بھی سُننے لگے، وہ آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔

"میں نے دیکھا آسمان پر ستاروں کا ایک محل ہے، اس میں بہت بڑے بڑے چمکدار ستاروں سے ایک دریچہ بنا ہے اور اس میں سے کوئی نیچے دیکھ رہا ہے۔" لمحہ بھر کو وہ رُکے، پھر بولے "وہ چہرہ کچھ کچھ تمھارے جیسا تھا۔ اُس نے مجھے اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ کرنوں کی ایک سیڑھی میرے قدموں سے آ لگی۔ میں نے جلنے کے لئے قدم بڑھائے تھے کہ اچانک نہ جانے کہاں سے ان گنت مہین مہین لوہے کے تار میرے پیروں میں اُلجھ گئے۔ میں نے جھٹکا دے کر چھڑانا چاہا، لیکن تار سختی سے لپٹتے چلے گئے۔ میں آزاد ہونے کی کوشش کرتے کرتے تھک گیا، میرے پیر زخمی ہو گئے۔ خون رسنے لگا ــــــ اور وہ لوہے کے تار اونچے ہوتے گئے، اونچے ہوتے گئے، مجھے قید کر لیا۔ یہ تار اتنے مہین تھے کہ دور سے نظر بھی نہ آئیں۔ اس نے آخری بار مجھ سے اوپر آنے کو کہا۔ لیکن میں نہ جا سکا۔ تب کرنوں کی سیڑھی ٹوٹ گئی۔ سیاہ بادل امنڈ کر آئے، ستاروں کا محل، دریچے میں جگمگاتا چہرہ سب کچھ نظر سے اوجھل ہو گیا" میں نے مہر آپا کی طرف دیکھا۔ انھوں نے اپنا چہرہ اندھیرے کے رُخ پہ کر لیا تھا پھر بھی میں نے ان کی خوب صورت آنکھوں سے ٹوٹ کر گرنے والے ان ستاروں کی جھلک دیکھ لی جو انھوں نے سب کی نظر بچا کر آنچل میں چھپا لئے تھے۔

وہ شام کتنی اُداس تھی۔ ہم نے سُنا مہر آپا کی شادی ہونے والی ہے۔

اسی شام مہر آپا ہمارے گھر بھی آئیں۔ ان کی سنہری لٹیں بکھری بکھری سی تھیں۔
آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ آکر باجی کے بستر پر لیٹ گئیں۔ اپنی پیشانی مل رہی تھیں۔
باجی ہولے ہولے ان کا سر دبانے لگیں۔ ہم سب خاموش اور اداس بیٹھے تھے۔
بھیّا آگئے۔ انھیں دیکھ کر مہر آپا اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ انھوں
نے عجیب نظروں سے بھیّا کی طرف دیکھا۔ بھیّا نے سر جھکا لیا۔ سامنے صوفے پر
بیٹھے بے چینی سے اپنے ہاتھ ملتے رہے۔ باجی ان کا دھیان ہٹانے کے لئے
اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔

کچھ دنوں بعد ہم نے سُنا وہ رشتہ کسی طرح ختم ہو گیا۔ ایک بار پھر بہار
آگئی۔ مہر آپا کے رخساروں کے گلاب شاداب ہو گئے۔ بھیّا کی شریر مسکراہٹیں
لوٹ آئیں لیکن کچھ دنوں بعد پھر ایسا ہی ہوا اور پھر مہینوں یہ قصہ چلتا رہا۔
پتہ نہیں یہ کیسے ہوتا، رشتے آتے مہر آپا کے کچھ کہے بغیر مسترد کر دیے جاتے۔
شائد یہ ان کے معصوم دلوں کی خاموش دعا تھی۔ ہم سب ٹھیک (Settle)
ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک شام جب خاندان کے بہت سے بزرگ
بیٹھے تھے باجی نے چپکے سے بھیّا کی شادی کی بات اٹھائی۔ ہم سب کھیل چھوڑ کر
وہیں آ بیٹھے۔ خوشی کے مارے ہم سب کے ننھے ننھے دل زور زور سے دھڑک
رہے تھے لیکن ہمارے دل کیسے ٹوٹ گئے جب ہم نے سُنا کہ بعض خاندانی
وجوہات ایسی ہیں کہ یہ رشتہ قطعی ناممکن ہے۔ باجی کے اوپر خوب ڈانٹ
بھی پڑی اور ہم سب کو آیندہ ایسی باتیں سوچنے سے سختی سے منع کر دیا گیا۔
مہر آپا کے خاندان والوں کو برا بھلا کہا گیا۔ ہماری سمجھ میں یہ باتیں خاک بھی
تو نہ آئیں۔ نہ جانے کیسی اُلجھی اُلجھی خراب باتیں تھیں۔

مہر آپا کی گلابی رنگت ماند پڑ گئی تھی۔ بجھی بجھی سی رہتیں۔ ہمارے گھر بھی
آنا بہت کم کر دیا تھا۔ خاص کر بھیّا کی موجودگی میں کبھی نہ آتیں۔ اگر ایسا اتفاق
کبھی ہو جاتا تو دونوں میں کوئی ایک اٹھ کر چلا جاتا۔ بھیّا کی مسکراہٹیں نہ جانے
کہاں کھو گئیں تھیں۔ وہ اپنی طرف سے بہت لاپرواہ رہنے لگے تھے۔ ایم۔ اے
کے بعد انھوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کا فارم بھرا تھا۔ ہم سب خوش تھے۔ بھیّا کو

ڈاکٹریٹ ملے گی۔ ڈاکٹر بھی کہلائیں گے۔ کتنا مزا آئے گا۔ لیکن اب تو انھیں نجانے کیا ہوگیا تھا۔ ہم نے دیکھا ان کی نامکمل تھیسس کے اوراق ادھر ادھر پڑے ملتے، کہیں کوئی بچّہ ناؤ بنا رہا ہے کوئی صفحہ کمرے سے باہر گھاس پر پڑا بھیگ رہا ہے۔ ان کے ایک بہت عزیز دوست ملنے آگئے۔ بھیّا کو پیار سے سمجھایا۔ ڈانٹا۔۔۔۔۔

یہ کیا روائتی مجنوں کا سا انداز ہے، لکھنا کیوں چھوڑ دیا۔ اپنا کیریئر کیوں بگاڑ رہے ہو اور بھیّا اپنی انگلیوں کی طرف حسرت سے دیکھتے رہے پھر بولے، مجھ سے کچھ لکھا نہیں جاتا جیسے میری سب صلاحیتیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔

ان کے دوست نے کہا پھر تم اپنے بزرگوں سے بغاوت کر دو۔ اپنا مستقبل کیوں تباہ کر رہے ہو؟

بھیّا عجیب سی ہنسی ہنس دئے۔ بغاوت نفرت سے جنم لیتی ہے۔ اور مجھے اپنے ماں باپ سے نفرت نہیں ہو سکتی، شدید محبت ہے۔

بھیّا کے دوست بے چارے تھک ہار کر چلے گئے۔

بھیّا اُن دنوں فلمیں بہت دیکھنے لگے تھے۔ کوئی ٹوکتا تو کہتے مجھے فلمیریا ہوگیا ہے۔ ایک بہت سرد رات کو سیکنڈ شو دیکھ کر آرہے تھے، راستے میں بارش ہونے لگی۔ اس رات ان کی طبیعت بہت خراب ہوگئی۔ ہم لوگ تمام رات ان کے پاس بیٹھے رہے۔ تیز بخار میں اُنھوں نے بار بار کسی کو پکارا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ مہر آپا کا نام تھا۔

دوسری صبح میں مہر آپا کے پاس گئی۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی کچھ سلائی کر رہی تھیں۔ میں نے بتایا بھیّا کی طبیعت رات سے بہت خراب ہے۔

"پھر میں کیا کروں" انھوں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ مجھے بہت بُرا لگا۔ وہ دن آیا جب یہ بھیّا کے ذرا سے لُو لگ جانے پر دن بھر بے قرار رہی تھیں۔ دل چاہا ابھی اٹھ کر چلی جاؤں۔ ایک بار پھر ان کی طرف جو دیکھا تو ان کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیر رہے تھے اور سفید انگلیوں سے خون کے چمک دار قطرے ٹپک رہے تھے۔ شائد سوئی چبھ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے درد ضبط

کرنے کی انتہائی کوشش کر رہی ہیں۔ میں اُٹھ کر چلی آئی۔ خیال تھا وہ کم از کم بھیّا کی عیادت کو آئیں گی ہی لیکن کئی دن گذر گئے، بھیّا اچھے بھی ہو گئے۔ وہ نہیں آئیں۔

ایک رات ہمارے یہاں بجلی چلی گئی تھی۔ باجی لیمپ جلائے جانے کیا لکھے جا رہی تھیں۔ میں بھیّا کے ساتھ ان کے پاس گئی۔ پتہ چلا مہر آپا نے کوئی مضمون فیئر (fair) کرنے کو دیا ہے جو انھیں دوسری صبح کالج کے کسی مقابلے میں پڑھنا ہے۔ مضمون جگہ جگہ سے مٹا ہوا سا تھا۔ باجی بار بار کہہ رہی تھیں یہ ہو نہیں سکتا، ناممکن ہے اس وقت اس کا لکھ جانا۔ بھیّا نے ان کے ہاتھ سے مضمون لے لیا، اپنے کمرے میں چلے گئے۔

دیر تک رات کو ان کے کمرے میں شمع کی روشنی دیکھی تو میں اندر چلی گئی۔ بھیّا بیٹھے وہی مضمون لکھ رہے تھے، نیند سے ان کی آنکھیں بھاری تھیں لیکن قلم تیزی سے چل رہا تھا۔ نجانے کب میں وہیں صوفے پر سو گئی۔ صبح کو آنکھ کھلی تو بھیّا جگا رہے تھے۔ لو جاؤ اپنی مہر آپا کو دے آؤ۔ میں مضمون دینے گئی۔ مہر آپا کالج جانے کو تیار کھڑی تھیں۔ میرے ہاتھ سے مضمون لے کر غور سے رائٹنگ دیکھی پھر کتابوں میں رکھ لیا۔ دیر تک گم سُم کھڑی خلا میں دیکھتی رہیں۔

ہم لوگ دیوداس دیکھنے جا رہے تھے۔ میں مہر آپا کو بلانے گئی۔ وہ پوچھنے لگیں کون کون جا رہا ہے۔ میں نے نام بتائے بھیّا کا نام اس ڈر سے نہیں لیا کہ کہیں مہر آپا جانے سے انکار نہ کر دیں۔ وہ فوراً تیار ہو کر میرے ساتھ آ گئیں۔ یہاں سب منتظر کھڑے تھے۔ بھیّا کو دیکھ کر وہ رک سی گئیں۔ میں نے سنا وہ باجی سے معذرت کر رہی تھیں۔ میں نہیں جا سکتی، میری طبیعت سست ہو رہی ہے۔" باجی قسمیں دینے لگیں۔ ہم سب پیچھے پڑ گئے۔ بھیّا نے ان کی طرف کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ مہر آپا کی آنکھیں چھلک آئیں، انھیں ہمارے ساتھ جانا ہی پڑا۔

پکچر دیکھ کر لوٹے تو رات ہو گئی تھی۔ ہم لوگ چمن ہی میں بیٹھ گئے۔ تاروں کی روشنی تھی۔ بھیّا بہت کھوئے کھوئے سے تھے، کئی بار پکارا لیکن انھوں نے جیسے سنا ہی نہیں۔

باجی نے یوں ہی کہہ دیا۔ "بھیّا آپ تو بالکل دیوداس بنے بیٹھے ہیں۔"

نہ جانے اس جملہ میں ایسی کیا بات تھی کہ ایک لمحہ کو بھیا اور مہر آپا کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ بہت دیر تک سکوت رہا پھر مہر آپا بولیں کچھ لوگ جان بوجھ کر غموں کو اپناتے ہیں۔ یہ غم پسند طبیعتیں ہوتی ہیں۔ باجی نے تردید کی لیکن مہر آپا سنبھلے سنبھلے لہجے میں اپنی بات ثابت کرنے کے لئے مثالیں دینے لگیں۔ بھیا اُٹھ کر چلے گئے۔

اس رات بھیا کھانے کی میز پر نہیں تھے۔ رات کو ہم سب برآمدے میں لیٹے تو میں نے دیکھا بھیا اپنے کمرے کے سامنے ٹہل رہے۔ ان کے خوب صورت خم دار بال کشادہ پیشانی پر بکھر آئے تھے۔ وہ بار بار شدید کش مکش کی سی کیفیت میں اپنی پیشانی رگڑتے کبھی دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیتے۔ میرا جی چاہا جا کر انھیں تسلی دوں، پھر ہمت نہ پڑی۔ مجھے نیند آنے لگی۔ ہلکی ہلکی نیند میں مجھے ایسا محسوس ہوا بھیا ٹہلتے ٹہلتے رک گئے ہیں۔ آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ وہی ستاروں کا محل نظر آرہا ہے۔ دریچے سے مہر آپا دیکھ رہی ہیں۔ کرنوں کی سیڑھی دھیمے دھیمے نیچے آرہی ہے . . . بھیا کے پیر نظر نہ آنے والے سخت تاروں میں اُلجھے ہیں . . . زخمی ہیں . . . خون رس رہا ہے۔

بہت سے ایسے عجیب دن بیت گئے، پھر سُنا مہر آپا کسی معمولی سے رشتے پر تیار ہیں۔ سب کو حیرت تھی۔ اس سے پہلے ان کے بہت سے اچھے اچھے رشتے آچکے تھے۔ ہمیشہ خاموش رہتی تھیں۔ اس بار کیا ہو گیا۔ باجی نے پوچھا تو بولیں "انتقام لے رہی ہوں"۔

پتہ نہیں یہ انتقام وہ کس سے لے رہی تھیں۔ اپنے دل کے کسی معصوم جذبے سے، انجی بھیا . . . یا اُن لوگوں سے جو ان کے درمیان حائل تھے؟

مہر آپا کی شادی میں ہم سب مدعو تھے۔ بھیا اس زمانے میں اپنے کسی دوست سے ملنے دوسرے شہر چلے گئے۔ مہر آپا دلہن بن کر بہت ہی پیاری لگ رہی تھیں۔ میرا دل چاہا انجی بھیا بھی دیکھتے۔ لیکن وہ تھے ہی کہاں . . . ہم لوگوں نے دولھا کو دیکھا تو اُداس ہو گئے۔ مہر آپا کی پسند پہ تعجب ہو گیا . . . میں تو غصے اور رنج کے مارے رخصت کے وقت ان سے ملنے بھی نہ گئی . . ایک عرصے تک سب چپ چپ سے رہے، رفتہ رفتہ سب ہی اپنی حالت پہ

واپس آ گئے صرف نجمی بھیا اتنے بدل گئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا یہ کوئی اور ہیں اور پہلے کے نجمی بھیا کوئی اور تھے۔ کچھ دن ایسے بھی گذرے۔

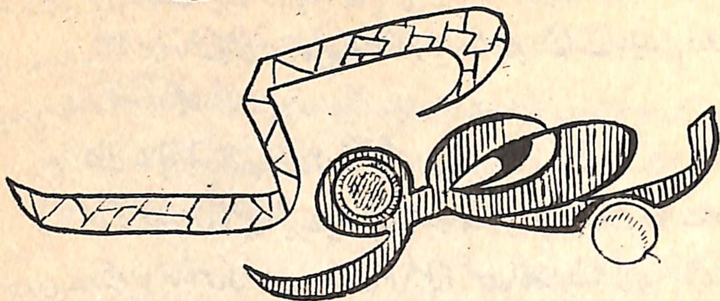
بھیا کو ٹائیفائڈ ہوا۔ پھر ٹائیفائڈ (Relaps) ہو گیا۔ کمزور تو تھے ہی ہاتھوں پر آ گئے۔ سارا کنبہ بدحواس تھا۔ ہم سب ان کی حالت دیکھ دیکھ کر چھپ چھپ کر روتے تھے۔ میرا دل چاہتا تھا مہر آپا کو دنیا کے اُس سرے سے اٹھا کر بھیا کے سامنے لے آؤں۔

کتنی عجیب تھی وہ رات۔ بھیا کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی۔ سب پریشان ان کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ سامنے کی کھڑکی کھلی تھی۔ جگ مگ کرتا ہوا چاند اونچا ہوا۔ بھیا کے سر پر چاندنی بکھر گئی۔ پتہ نہیں انھیں کیا یاد آیا آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ اسی وقت کوئی سفید لفافہ لئے کمرے میں آیا۔ پتہ چلا مہر آپا کی اچانک موت کی اطلاع ہے۔ سب سکتے میں رہ گئے —— بھیا کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ یہ بات پہلے سے جانتے تھے —— بہت دیر تک سب خاموش رہے۔ بھیا چاند کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہے تھے —— آہستہ سے بولے۔ "انتظار تو کیا ہوتا" اور اُس رات —— ہاں اسی رات بھیا ہم سے ہمیشہ کے لئے روٹھ کر چلے گئے۔

زمانہ گذر گیا۔ ہم نے وہ پیارا دیس چھوڑ دیا۔ ہم سب اتنے بڑے ہو گئے۔ یہ زمین جس کے سینے پر اتنے پھول کھاتے ان میں ان کی یادیں مہکتی ہیں —— ایسا لگتا ہے جیسے چمن کے سب پھولوں میں ان کے مسکراتے چہروں کا عکس ہے۔ چاند نکلا تو مہر آپا کی تصویر لئے۔ شام کا پہلا تارا چمکا تو جیسے نجمی بھیا مسکرا دئے۔ ہلکی ہلکی ہوا چلی تو ان دونوں کی میٹھی میٹھی پیار بھری آوازیں سنائی دیں ——

—— آج جب میں اپنے وطن واپس آئی ہوں ——

نٹ ہمسن (ترجمہ۔ضیا شاہد)



اُن دنوں میں کرسچینا کے شہر میں تھا اور بھوکوں مر رہا تھا۔ایک ایک کرکے مَیں اپنا سامان گروی رکھ چکا تھا اور اب کمرے کے ننگے فرش پر آلتی پالتی مارے اپنی قسمت پر آٹھ آٹھ آنسو بہا رہا تھا۔چند روز پہلے میں نے ایک جگہ ملازمت کے لیے درخواست بھیجی تھی،لیکن مَیں وہاں دیر سے پہنچا۔منّت سماجت کرنے کے باوجود مجھے یہ ملازمت نہ مل سکی۔ایک دوسری جگہ پچاس تنلنگ کی ضمانت طلب کی گئی جو میں کسی صورت میں بھی ادا نہیں کر سکتا تھا۔میں نے تو فائر بریگیڈ میں مزدور بننے کی بھی کوشش کی تھی،لیکن نظر کمزور ہونے کی وجہ سے مجھے رد کر دیا گیا۔دوسری مرتبہ میں عینک اُتار کر وہاں گیا۔میں نے بھویں تان لیں اور نگاہوں کو تیز بنانے کی پوری کوشش کی لیکن انسپکٹر میرے قریب سے مسکراتا ہوا گزر گیا۔شاید اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔میری حالت انتہائی خراب تھی۔میرے پاس کنگھی تک نہیں رہی تھی۔میرے بال اس قدر اُلجھ چکے تھے کہ ایک بار حجّام نے مجھے دوکان سے صرف اس لیے باہر نکال دیا کہ میں نے اس کی کنگھی توڑ ڈالی تھی۔ساری گرمیاں مَیں نے قبرستان میں گزار دی تھیں۔مَیں اخبار کے لیے مضمون لکھا کرتا اور ایڈیٹر کے انکار کی پروا کیے بغیر لکھتا چلا گیا۔سورج کی کرنیں کھڑکی کے راستے اندر آ رہی تھیں۔میں نے صراحی سے پانی پیا اور تھوڑا سا پانی پتلون کے گھٹنوں پر چھڑک دیا تاکہ اُن پر چمکتا ہوا میل مدھم پڑ جائے۔پنسل اور کاغذ جیب میں رکھ کر مَیں باہر نکل آیا۔میرے پیٹ میں کھدبد ہو رہی تھی۔مَیں نے سوچا نہ کاش!ذرا سا کھانے کو مل جائے۔قصّاب کی دوکان پر ایک عورت گوشت خرید رہی تھی۔کچا گوشت دیکھ کر مجھے متلی سی ہونے لگی۔

گرینڈ دسن بازار میں مجھے پال ملا۔ میں اُس کی طرف بڑھا، لیکن وہ آنکھیں چُرا کر نکل گیا۔ شاید وہ یہ سمجھتا تھا کہ کہیں میں اُس سے ایک آدھ شلنگ نہ مانگ لوں۔ مجھے ہر قیمت پر ایسا مقالہ لکھنا تھا جو دس شلنگ میں کہیں بک جائے۔ میرے آگے ایک بوڑھا اپاہج چل رہا تھا۔ میں یونہی اُس کے تعاقب میں چل پڑا۔ وہ جہاں جاتا، میں سائے کی طرح اُس کا پیچھا کرتا۔ آخر ایک موڑ پر میں نے اُسے جا لیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو گھور کر دیکھا۔

"روٹی کے لیے ایک پینی چاہیئے، مل سکے گی؟"

میں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ میرے پاس ایک دھیلہ تک نہیں تھا۔ بوڑھا میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی صورت بہت مکروہ تھی، میلی آنکھیں، جھرّیوں بھرا چہرہ اور چھوٹا سا منحنی جسم۔ مجھے اس پر ترس آ گیا۔

"کیا کرتے ہو؟"

"جوتے بنایا کرتا تھا، آج کل بیکار ہوں۔ یقین جانیے پانچ روز سے بھوکا ہوں"

میں تیز قدموں سے بائل بازار کی طرف لپکا جہاں ایک بوڑھا دوکاندار چیزیں رہن رکھنے کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ میں نے دوکان کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی واسکٹ اُتاری اور اندر جا کر اُسے رہن رکھ دیا۔ ڈیڑھ شلنگ لے کر میں تیزی سے اپاہج بوڑھے کی طرف لوٹا۔ ایک شلنگ کی خطیر رقم لے کر وہ میری طرف اس طرح گھورنے لگا جیسے وہ مجھے پاگل سمجھتا ہو۔ حیرت سے اُس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ مجھے اُسکی اِس حرکت پر بیحد غصّہ آیا۔ آخر وہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ ایک شریف آدمی نے اپنی واسکٹ رہن رکھ کر ایک شلنگ دیا تھا اور وہ اُسے ٹکر ٹکر گھورے جا رہا تھا۔ میں نے اُسے ایک ڈانٹ بتائی اور آگے بڑھ گیا۔ نانبائی کی دوکان کے سامنے پہنچ کر میری بھوک چمک اُٹھی۔ جی چاہتا تھا کہ آدھ شلنگ کسی اگلے وقت کے لیے اُٹھا رکھوں، لیکن میں ضبط نہ کر سکا۔ تقریبًا بھاگتا ہوا دوکان میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں روٹی اور پنیر کا بنڈل لیے پارک کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا۔ پنیر اور روٹی کھا کر طبیعت کچھ بحال ہوئی۔ پیٹ بھر کھانے کے بعد میں نے چہل قدمی شروع کر دی۔ پارک میں بھیڑ چھٹتی جا رہی تھی۔ مجھے ہر حال میں ایک مقالہ مکمل کرنا تھا اور مجھے پنسل نہیں مل رہی تھی۔ نئی پنسل خریدنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ غصّے میں آ کر میں موٹی موٹی گالیاں بکنے لگا۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ پاسک بازار میں چل کر کسی سے عارضیتًا پنسل مانگ لی جائے۔ پہاڑی راستہ عبور کرتے ہوئے مجھے دو عورتیں ملیں۔ ایک عورت کے بازو سے میرا بازو چھو گیا۔ وہ رُک گئی اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے جلدی سے بات بنانے

ہوئے کہا:

"آپ نے اپنی کتاب کیوں پھینک دی، کیا اب آپ کو اس کی ضرورت نہیں رہی؟"

اُس نے خوف زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر بڑبڑاتی ہوئی آگے چل دی۔ میری شیطنت بھڑک اُٹھی۔ جی چاہتا تھا کہ اسے اور تنگ کیا جائے۔ لیکن پنسل کے خیال نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ راہن کی دوکان پر پہنچ کر میں نے دوکاندار سے اپنی واسکٹ طلب کی، جیب سے پنسل نکال کر میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:

"یہ پنسل مجھے بیحد عزیز ہے۔ اس سے میں نے "فلسفہ اور شعور" کے نام سے ایک مکمل کتاب لکھی تھی۔" دوکاندار متعجب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اُسے خدا حافظ کہا اور باہر آ گیا۔

بارہ بجے تک میں بازار میں بلا مقصد گھومتا رہا۔ لوگ بڑے اطمینان سے اِدھر اُدھر چل پھر رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُنھیں کبھی رنج و الم سے پالا نہیں پڑا۔ میں خاموشی سے اپنی حالت پر غور کرنے لگا۔ آخر دنیا بھر کے مصائب مجھی کو کیوں اپنا نشانہ بناتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ نیک بننے کی کوشش کی تھی، لیکن لوگوں نے ہمیشہ میرے اندر کے انسان کو ختم کرنا چاہا۔ میں اس قدر نڈھال ہو چکا تھا کہ مجھ میں مزید چلنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ میرے سارے جسم میں درد ہو رہا تھا اور خوراک پیٹ میں جا کر تکلیف پیدا کر رہی تھی۔ میرا سر گھوم رہا تھا اور وہ لوگ جو میرے برابر سے گزر رہے تھے، مجھے پرچھائیاں محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے جیب سے کاغذ نکالا، لیکن چند سطروں سے زیادہ نہ لکھ سکا۔

اچانک مکھیوں کا ایک غول مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ وہ مجھے کاٹ رہی تھیں، میرا خون پی رہی تھیں جو پہلے ہی گاڑھا ہو چکا تھا۔ میں نے اُنھیں ہٹانے کی کوشش نہیں کی اور بڑی دلچسپی سے ان کو بار بار حملہ کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اس وقت میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مجھے اپنے گرد و پیش سے مکمل واقفیت تھی۔ میں نے اپنی ٹانگوں کو ہلانا چاہا، لیکن وہ اس قدر کمزور تھیں کہ حرکت نہ کر سکیں۔ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ میں نے سختی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر بھی آنسوؤں کے قطرے میرے رخساروں پر بہنے لگے۔ ایک کوتاہ قد بوڑھا میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے جلدی سے آنکھیں پونچھیں اور اسکی طرف دیکھنے لگا۔ بوڑھے نے میری طرف ذرہ برابر بھی توجہ نہیں دی۔ کیا اِس بوڑھے کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خاموش نہ رہے۔ میں نے اپنی خالی جیب ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"سگریٹ پئیں گے آپ؟"

"شکریہ"

میں بوڑھے میں دلچسپی لے رہا تھا، لیکن وہ برابر بے توجہی برت رہا تھا۔

"کیا آپ جانتے ہیں کہ آجکل ایسی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کے حروف میں بجلی ہوتی ہے؟"

"کیا مطلب؟" بوڑھے نے ذرا ناگواری سے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے کہ رات کو بجلی کی وجہ سے ان کتابوں کے حروف چمکنے لگتے ہیں"۔

"ہاں، میں نے بھی سنا ہے۔" وہ بیزاری سے بولا۔ اس خیال نے مجھے مایوس کر دیا کہ میرے جھوٹ پر بالکل متعجب نہیں ہوا تھا۔

"عجیب آدمی ہو تم! میں کب سے جھوٹ کے پل باندھ رہا ہوں اور تم ہونقوں کی طرح اُسے سُن رہے ہو۔ شاید تم مجھے کوئی مفلوک الحال شخص سمجھتے ہو۔ میں یہ سلوک کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔"

بوڑھا اُٹھ کھڑا ہوا اور خوف زدہ نظروں سے میری طرف دیکھتا ہوا اپنا بنڈل اُٹھا کر چل پڑا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ میرے پیٹ میں پھر کھد بد ہونے لگی تھی۔ میں نے دونوں ٹانگیں پھیلا دیں اور اونگھنے لگا۔ میں سونے ہی والا تھا کہ پارک کے محافظ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"تمھیں یہاں نہیں سونا چاہیے"۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا اور لڑکھڑاتے قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔ مجھے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔ میری تلاش کردہ اسامیاں پُر ہو چکی تھیں اور جتنی سفارشیں میں نے تلاش کی تھیں، وہ سب ان لوگوں کی تھیں جنھیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ میرے چاروں طرف گلاب کے پھول کھلے تھے لیکن ان کی خوشبو مجھے پاگل بنائے جا رہی تھی۔ میں اپنے آپ کو ایک کیڑا محسوس کر رہا تھا۔ زمین پر رینگنے والا ایک کیڑا جس کی اس کائنات میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔ میں نے گھاس کے تختے پر بیٹھ کر ایک مرتبہ پھر مقالہ لکھنے کی کوشش کی، لیکن مجھے اپنی کھوپڑی میں خلا سا محسوس ہو رہا تھا۔ سردی ناقابل بر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے کوٹ کے بٹن بند کیے اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ پارک کے دروازے پر مجھے دوبار وہ بوڑھا دکھائی دیا۔ اخبار پر کھانے کی چیزیں پھیلائے وہ بڑے اطمینان سے انھیں ہڑپ کر رہا تھا۔ مجھے اس کی انگلیاں چیل کے پنجوں کی طرح دکھائی دیں۔ اس نے مجھے پہچاننے کی کوشش نہیں کی۔ اخبار فروش کی دوکان پر میں نے "ضرورت ہے" کا کالم پڑھا۔ ایک پنساری کو ہفتے میں دو گھنٹ کے لیے ایک کلرک کی ضرورت تھی۔ میں نے اس کا پتہ نوٹ کر لیا اور آگے بڑھ گیا۔ گھر پہنچا، تو مالک مکان کی طرف سے ایک رقعہ ملا جس میں لکھا تھا کہ میں کرایہ پیشگی ادا کر دوں، ورنہ مکان تبدیل کر آخر میں لکھا تھا "آپ کا دوست مسٹر گنڈرسن"۔ میں گول گھومنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دفعتہً مجھے دو

جملے ایسے سوجھے جنھیں میں کسی مقالے میں استعمال کر سکتا تھا۔ میں نے اُنھیں دو تین بار دُہرایا اور کاغذ پر لکھنے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے میرے اندر سے کوئی بول رہا ہو۔ ایک لفظ کے بعد دوسرا لفظ خود بخود آتا چلا گیا اور آخر کار بیس صفحات پر مشتمل ایک عمدہ مقالہ تیار ہو گیا۔ میرے اندر سے اس وقت رنگ اور اُجالے کا لاوا پھوٹ رہا تھا۔ میرا دل اطمینان کی دولت سے مالا مال تھا۔ میں نے اسے ایڈیٹروں کے انداز سے تولا اور قیمت کا اندازہ کرنے لگا۔ کام مکمل کر کے میں نے موم بتی بجھا دی، فرش پر لیٹ گیا اور رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔

صبح اُداس اور نم آلود تھی۔ میں نے مسودہ جیب میں رکھا اور حسب معمول پتلون کے گھٹنوں پر پانی چھڑک کر باہر نکل کھڑا ہوا۔ میں نے ایک پرزے پر مالکہ مکان کے نام خط لکھا کہ میں مکان چھوڑے جا رہا ہوں۔ میں بہت خوش تھا۔ ایک انجانی مسرت سے میرا دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ میں سیٹی بجاتے ہوئے ایسا طریقہ سوچنے لگا جس سے مجھے ناشتہ مل سکے۔ میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا، یہاں تک کہ دس بج گئے۔ ابھی تک مقامی اخبار کا ایڈیٹر دفتر نہیں آیا تھا۔ میں نے مسودہ اس کی میز پر رکھ دیا اور باہر نکل آیا۔ دوپہر تک میں دکانوں کے اشتہار پڑھتا رہا۔ چار بجے سے پہلے ایڈیٹر سے ملنے کا کوئی فائدہ نہ تھا، اس لیے میں نے دیہات کا رُخ کیا۔ کھیتوں میں اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد میں شہر کی طرف لوٹا۔ راستے میں دو گاڑی بان مجھے ملے۔ پاس سے گزرتے وقت ایک نے میرے کندھے پر ایک چابک رسید کیا۔ میں نے اپنے کندھے کو سہلایا اور گری ہوئی ٹوپی اٹھا کر راستے پر ہو لیا۔ اخبار کے دفتر پہنچا، تو معلوم ہوا کہ ابھی تک ایڈیٹر صاحب نے میرا مقالہ نہیں پڑھا۔ میں دل برداشتہ ہو گیا اور گرتا پڑتا ساحل سمندر کی طرف چلا۔ لکڑی کے ایک بنچ پر مجھے تھوڑی سی جگہ مل گئی۔ کھانے کا خیال بار بار مجھے پریشان کر رہا تھا۔ سامنے سمندر میں جہاز ہچکولے کھا رہے تھے۔ مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی اور پھر میں وہیں سو گیا۔ آنکھ کھلی تو سردی سے میرا جسم اکڑ چکا تھا۔ میں نے اپنے بازوؤں پر تھپڑ مارے اور پنڈلیاں سہلائیں تاکہ ان میں کچھ جان آجائے۔ بھوک اور سردی سے ٹھٹھرتا ہوا میں بازار کی طرف چلا۔ میرے پیٹ میں سخت جلن تھی۔ میں فحش گالیاں بکنے لگا۔ راستے میں میرے ایک واقف کار کا مکان نظر آیا۔ میں نے مٹھیاں بھینچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ شب خوابی کے لباس میں میرا مصور دوست باہر نکلا اور مجھے دیکھتے ہی بولا:

"اب بھلا اس تصویر کو کیسے دیکھ سکو گے؟"

"میں اسی وقت دیکھنا چاہتا ہوں"، میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا، حالانکہ مجھے علم بھی

نہ تھا کہ وہ کس تصویر کا ذکر کر رہا ہے۔

اِس وقت یہ بالکل ناممکن ہے۔ ویسے بھی آج میرے ہاں ایک" مہمان" ٹھہرا ہوا ہے" اس نے آنکھ مارتے ہوئے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

میرے لئے اب کوئی ایسی جگہ نہیں رہی تھی جہاں میں رات بسر کر سکوں۔ رات گزارنے کا مسئلہ بہت پریشان کن تھا۔ نانبائی کی دکان پر بے شمار چھوٹی بڑی ڈبل روٹیاں رکھی تھیں۔ میں نے انہیں چھونے کی کوشش کی، لیکن شیشے کی الماری میں بند تھیں۔ کھسیاتا ہو کر میں آگے چل دیا۔ دو گھنٹے کی طویل آوارگی کے بعد بھی مجھے سونے کے لیے جگہ نہ مل سکی۔ آخر میں نے باغ کے ایک تاریک گوشے میں تھوڑی سی گھاس اکٹھی کی اور اپنے سامان کی گٹھری میں سے کمبل نکال کر وہیں لیٹ گیا۔ صبح تک میں سردی، بھوک، غم اور غصے سے اڑتا رہا اور بالآخر سو گیا۔ جب میری آنکھ کھلی، سورج سر پر چمک رہا تھا۔ میں نے جوتے پہنے اور بھیگے ہوئے کتے کی طرح کانپتا ہوا شہر کی طرف چل دیا۔ سردی سے میرے پاؤں مفلوج ہو چکے تھے، آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ سُوں سُوں کرتا اور گرتا پڑتا میں بازار تک پہنچ گیا۔ بھوک اب پورے جوبن پر تھی بار بار مجھے اپنے آپ کو گرنے سے سنبھالنا پڑتا۔ ایک ستے سے ہوٹل کے سامنے پہنچ کر میں نے اندر کو جھانکا اور پھر کسی واقف کار کو نہ پا کر سٹیشن کی طرف چل دیا۔ پلیٹ فارم کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر میں نے سوچا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ یکایک یہ خیال گزرا کہ میں اپنے رسمی اخلاق کو خیرباد کہہ دوں اور اپنے دوست کا یہ کمبل گروی رکھ دوں۔ مستقبل میں کبھی میرے ہاتھ کوئی رقم لگی تو میں اُسے چُھڑا لوں گا۔ میں نے اِس خیال کو سختی سے دبا دیا لیکن میرے قدم بے اختیار اس دکان کی طرف بڑھنے لگے جہاں لوگ اپنی چیزیں رہن رکھا کرتے تھے۔ میں اب دُکان کے سامنے تھا۔ میں نے کمبل کو اچھی طرح تہہ کیا تاکہ وہ دیکھنے میں نیا معلوم ہو۔ میں سیڑھیاں چڑھنے ہی والا تھا کہ ایک غیبی طاقت نے مجھے روک لیا۔ میں تیزی سے مڑا اور بھاگنے لگا۔ میں جلد سے جلد اس دُکان سے دور جانا چاہتا تھا جو مجھے گناہ کی ترغیب دے رہی تھی۔ میں جی میں خوش تھا کہ میں نے اپنی کمزوری پر فتح پالی ہے۔ انسانیت کا سمندر تعفن سے بھرپور تھا، لیکن میرے کردار کی چادر ابھی تک اُجلی تھی۔ دفعتہً مجھے اس دوکاندار کا خیال آگیا جسے ایک کلرک کی ضرورت تھی۔ میں آہستہ آہستہ اس کی طرف چل دیا۔ ایک موٹے تازے شخص نے جیب سے میری درخواست نکالی۔

"دیکھیے صاحب، آپ نے ۱۸۸۴ کے بجائے ۱۸۴۸ء لکھا ہے"۔

"میں معافی چاہتا ہوں، آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں ہوگی"۔

"مجھے ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو حساب کی غلطیاں نہ کرتا ہو۔" اب یہ اسامی پُر ہو چکی ہے۔
غضب آلود ہو کر میں مُڑا اور زیرِ لب گالیاں دیتا ہوا ایک شخص سے ٹکرا گیا۔ پاس ہی ایک
کانسٹیبل کھڑا تھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ وہ مجھے گرفتار کر لے۔ یہ سوچ کر میں نے اُس آدمی نے ایک تھپڑ
رسید کیا۔ میں دانستہ طور پر وہیں کھڑا رہا تاکہ کانسٹیبل مجھے آسانی سے پکڑ سکے، لیکن اس نے میری طرف
مطلق توجہ نہ دی۔ اب میری انتڑیاں کلبلا رہی تھیں۔ آہ! میں اتنا گر گیا تھا کہ حوالات میں پہنچنے کی
کوشش کر رہا تھا۔ چلتے چلتے میرے سامنے ایک تین منزلہ عمارت آ گئی۔ میرے قدم بے اختیار بڑھتے
چلے گئے۔ میں سیڑھیاں طے کر کے دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ باورچی خانے سے دھوئیں کی ایک پتلی لکیر آسمان
کی طرف اُٹھ رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک عورت کا سر باہر نکلا۔

"کیا ہے؟"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اسے کیا جواب دوں۔ میں نے ٹوپی اُتار کر اُسے سلام کیا اور ایک لفظ
کہے بغیر مُڑا اور جلدی جلدی نیچے اُترنے لگا۔

"سُنو میرے یہاں آج کچھ نہیں ہے، ورنہ میں تمھیں ضرور خیرات دیتی۔"

یہ فقرہ ایک تیر کی طرح میرے سینے میں پیوست ہو گیا۔ آخر اس نے مجھ میں کونسی بات دیکھی تھی
جو وہ بھک منگا تصور کر رہی تھی۔ بازار میں گوشت کی سوندھی سوندھی خوشبو میرا تعاقب کر رہی تھی اور
میں کندھے اُٹھائے چلتا رہا۔ میرے سر میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ میں نے جو پانی پیا تھا وہ پیٹ میں جا کر
جلن پیدا کر رہا تھا۔ قبرستان میں پہنچ کر ایک قبر کی چوڑی سِل پر اوندھے مُنہ لیٹ گیا۔ دفعتہً مجھے اپنی
ٹائی کا خیال آیا۔ میں نے کوٹ کے کالر اوپر چڑھا لئے اور ٹائی اتار کر ایک کاغذ میں لپیٹ لی۔ ایک ہوٹل
کے سامنے ایک خوش پوش نوجوان کو سگریٹ پیتے دیکھ کر میں نے ٹائی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

"یہ ٹائی ہے تو پرانی، لیکن چھ پنس میں اتنی بری نہیں ہے۔ لیجیے گا۔"

"میں نے رات باہر گزاری ہے اور اس وقت میری جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں"۔

"معاف کیجیے، دراصل میں چار دنوں سے بھوکا ہوں۔" میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔ یہ
کہہ کر میں نے ٹائی اس کے ہاتھ میں دے دی اور بغیر سوچے سمجھے ایک طرف چل دیا۔ خوش پوش
نوجوان مجھے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا:

"اپنی ٹائی تو لیتے جاؤ۔"

"بس دوست، اسے تم رکھ لو۔ یہ میری کل کائنات ہے۔" یہ کہہ کر میری آنکھوں سے

آنسو بہہ نکلے۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ وقت بڑی آہستگی سے کھسک رہا تھا۔ جنگل میں سونے کی سکت نہیں تھی۔ میں نے گرجا گھر کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی اور کمبل اوڑھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔
اچانک میں اُٹھ بیٹھا۔ کوئی مجھے جھنجوڑ رہا تھا۔ اندھیرے میں چمکتے ہوئے بٹنوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ کوئی کانسٹیبل تھا۔

"تم کہاں رہتے ہو؟" اس نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔ میں نے اپنی پرانی جائے رہائش کا پتہ بتایا۔

"اگر تم یہاں بیٹھے رہے، تو سردی سے اکڑ جاؤ گے۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنے گھر کی راہ لو۔

میں خاموشی سے اٹھا اور اپنے پرانے گھر کی طرف چل دیا۔ سیڑھیوں کے سامنے پہنچ کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر دبے پاؤں اوپر چڑھنے لگا۔ مالکہ مکان کے سامنے سے گزرتے وقت میں نے اپنی سانس روک لی۔ خوش قسمتی سے وہ اپنے بچے کو کھانا کھلا رہی تھی اس لیے اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ پورے کمرے میں ہر چیز جوں کی توں پڑی تھی میز پر کاغذ کا ایک پرزہ رکھا تھا۔ کھڑکی سے آتی ہوئی دھندلی روشنی میں میں نے اسے پڑھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا اُسی طرح دبے پاؤں چلتا ہوا میں باہر نکل آیا۔ سڑک پر گیس کی روشنی میں جا کر میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط کو کھولا خوشی میں میں نے ایک نعرہ لگایا۔ ایڈیٹر کے اس خط میں لکھا تھا کہ میرا مقالہ قابل اشاعت تھا اور اس کا معاوضہ دس شلنگ مقرر کیا گیا تھا۔ میں نے جی کھول کر قہقہے لگائے اور سڑک پر بلا مقصد دوڑنے لگا۔ کسی چوک میں کھڑا ہو کر دو، چار نعرے لگاتا اور راہیوں کو حیران و ششدر چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا۔ میں رات بھر گلیوں کے چکر کاٹتا رہا حتّٰی کہ صبح ہو گئی۔

* * * * * * * * *

ایک ماہ بعد میں باغ کے ایک قطعے میں بیٹھا ہوا مقالہ لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں پھر بھوکا تھا۔ دس شلنگ کبھی کے ختم ہو چکے تھے۔ تین دن سے پانی کے سوا کوئی چیز میرے حلق سے نہیں گزری تھی۔ میری جیب میں ایک ٹوٹے ہوئے چاقو اور چابیوں کے زنگ آلود گچھے کے سوا کچھ نہ تھا۔ باغ کا پھاٹک بند ہونے والا تھا۔ میں اُٹھ بیٹھا اور گھر کی طرف چل دیا۔ اب میرا گھر قلعی گر کی ایک خالی دکان میں تھا بھوک شدید ہوتی جا رہی تھی۔ میری نظر اپنے ہاتھوں پر پڑی، تو میں بھونچکا سا رہ گیا میرے ہاتھ چیل کے پنجوں کی طرح غلیظ اور مکروہ تھے۔ بھوک سے میرا برا حال تھا۔ میرا لباس بھیگ

چکا تھا۔ میرا پاؤں پھسل گیا اور میں چاروں شانے چت زمین پر گر پڑا۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر میں اُٹھ کھڑا ہوا اور دوبارہ گھر کی طرف رینگنے لگا۔ معدے کی تلخی مٹانے کے لیے میں بار بار تھوک نگلتا تھا۔ میرے سینے میں درد ہو رہا تھا۔ قلعی گر کی خالی دکان میری منزل مقصود تھی، لیکن مجھے اس سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ دکان کا فرش کچا تھا اور سیلن کی وجہ سے اس کی دیواروں میں جا بجا شگاف پڑے ہوئے تھے۔ ایک رنگ ساز کی دوکان پر پہنچ کر میرے قدم رُک گئے اور میں اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اندر دھندلی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے دروازے کو زور سے دھکا دیا، لیکن کواڑ آپس میں مضبوطی سے ملے ہوئے تھے۔ بڑی سڑک پر پہنچ کر مجھے کانسٹبل دکھائی دیا۔

"رات کے دو بج چکے ہیں اور تم ابھی تک یہاں پھر رہے ہو۔" اس نے مجھ سے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"نہیں، ابھی صرف دس بجے ہیں۔" میں نے تقریباً رو دینے کے انداز میں کہا۔

میں آہستہ آہستہ چلتا رہا، یہاں تک کہ قلعی گر کی دکان کا دروازہ میرے سامنے آ گیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چابیاں نکالنے کی کوشش کی، لیکن چابیاں موجود نہیں تھیں، شاید وہ کھو گئی تھیں۔ مجھے اپنے آپ پر بے حد غصہ آیا۔ شدید افلاس نے مجھے ادھ مؤا کر دیا تھا۔ میرے گھٹنے جسم کا بوجھ سہارنے سے جواب دے رہے تھے۔ پھر اچانک بارش ہونے لگی۔ ذرا سی دیر میں پانی کے قطرے میری گردن تک پہنچ رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے عنقریب میں سردی سے منجمد ہو جاؤں گا۔ اس بارش نے تو میری رہی سہی طاقت بھی ختم کر دی تھی۔ میں سڑک پر دوڑنے لگا۔ رات کے تین بجے بارش میں بھیگتے ہوئے کسی سنسان سڑک پر دوڑنا کتنی غیر شریفانہ حرکت معلوم ہوتی ہے۔ ٹاؤن ہال کے سامنے پہنچ کر میں رُک گیا۔ یہی جی میں آئی کہ چوکیدار سے رات برآمدے میں گزارنے کی اجازت لوں۔ ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ وہی کانسٹبل مجھے دوبارہ سڑک پر دکھائی دیا۔

"تم حفاظت خانے میں کیوں نہیں چلے جاتے؟"

اور میں اس کے پیچھے ہو لیا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" حفاظت گاہ میں کلرک نے مجھ سے سوال کیا۔

"ٹنگون، آنڈرے ٹنگون"۔

"پتہ؟"

"جرنلسٹ"۔

"کون سے اخبار میں کام کرتے ہیں آپ؟"

"ڈیلی بلیڈٹ میں۔ مَیں انتہائی شرمندہ ہوں، دراصل مجھ سے اپنے کمرے کی چابیاں کھو گئی ہیں۔"

تھوڑی دیر کے بعد میں حوالات کے ایک نسبتاً صاف کمرے میں آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا، نیند پھر بھی نہیں آرہی تھی۔ تاریکی آنکھوں میں گھُسی جا رہی تھی۔ مَیں نے اپنے آپ کو تسلیاں دینے کی کوشش کی، بازو لہرائے۔ آخر میں بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ورزش کرنے لگا تاکہ تھک کر سونے کے قابل ہو سکوں۔ لیکن میرے جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا اور اس حالت میں ورزش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا وجود تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔ صرف ذہن باقی تھا، میری پریشاں خیالی بڑھتی چلی گئی۔ آخرکار مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے نلکے کی ٹونٹی سے جی بھر کر پانی پیا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اب ضرور کہیں سوؤں گا، لیکن میں پھر بہکنے لگا۔ میرے حلق سے گالیاں بے اختیار نکل رہی تھیں۔ جوش میں نے مٹھیاں بھینچ لیں اور دیوار سے سر ٹکرانے لگا۔ صبح تک میں چیختا چلاتا رہا۔ صبح کی سپیدی نمودار ہوئی، تو میں نے آرام کا سانس لیا، اپنی پلکوں کو ڈھلک جانے دیا اور گہری نیند سو گیا۔ دروازے پر دستک سے میری آنکھ کھُل گئی۔ دو سپاہی مجھے پکڑ کر ایک بڑے کمرے میں لے گئے۔ نیچے بے گھر لوگوں کو ناشتے کی پرچیاں مل رہی تھیں۔ مَیں رشک بھری نظروں سے ان پرچیوں کو دیکھنے لگا۔ کاش! ایک آدھ پرچی مل جائے۔ اچانک ڈیوٹی آفیسر میری طرف متوجہ ہوا۔

"مسٹر آندرے جرنلسٹ، آپ گھر جا سکتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں، تو مَیں ایک سپاہی کو آپ کے ساتھ بھیج دوں؟"

"جی نہیں۔" میں نے رسمی طور پر اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنا کمبل اُٹھا کر حوالات سے باہر نکل آیا۔ میں بھوکا تھا اور اندر قیدیوں کو کھانا مل رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ناشتے کی پرچی کے لیے رونا شروع کر دوں۔ صاف صاف کہہ دوں کہ میں چھ دن سے بھوکا ہوں، لیکن ہمت نہ پڑی۔ میں تو ایک اخبار کا معزز ملازم تھا، بھلا میں بھوکا کیسے رہ سکتا تھا۔ صبح حسین اور چمکیلی تھی اور میں دھوپ کھاتا ہوا گھر کی طرف کھسک رہا تھا۔ قلعی گر کی دکان کے سامنے مجھے اس کا لڑکا ملا۔

"جناب! آپ کے پاس پانچ شلنگ ہوں گے؟ مجھے آج ہی مکان کا کرایہ ادا کرنا ہے۔" اس نے بڑی لجاجت سے مجھ سے دریافت کیا۔

میں نے بڑی نرمی سے اُسے دوپہر تک انتظار کرنے کے لیے کہا۔ بستر پر پہنچ کر میں دھم سے گر پڑا۔ پڑوس میں کوئی گوشت بھُون رہا تھا۔ میں نے اپنی ناک بند کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن یہ خوشبو میرے نتھنوں میں گھُسی چلی جا رہی تھی۔

بمشکل دس بجے اُٹھا اور پاؤں گھسیٹتا ہوا اخبار کے دفتر کی طرف چلا۔ ایڈیٹر ابھی تک نہیں آیا تھا، اس لیے میں کچھ دیر سیڑھیوں پر انتظار کرتا رہا۔ دفعتہً مجھے اپنے ایک دوست کا خیال آیا اور میں رینگتا ہوا بوڈگن روڈ کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ مکان چھوڑ چکا ہے اور آج کل آگرا اسٹریٹ میں مقیم ہے۔ بھوک سے بلبلاتا ہوا میں آگرا اسٹریٹ کی طرف روانہ ہوا۔ میں وہاں پہنچا، تو معلوم ہوا کہ وہ چھٹیاں گزارنے گاؤں گیا ہوا ہے۔ بھٹیارے کی دکان پر خریداروں کا ہجوم دیکھ کر میں نے ان سے کچھ مانگنے کی کوشش کی، لیکن ہمت نہ پڑی۔ میرے اندر کوئی مجھے ہاتھ پھیلانے سے روک رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے تھے۔ میں پھٹی پھٹی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ میرے چہرے پر پسینے کے قطرے تیرنے لگے۔ بھیگی ہوئی پلکوں سے میں نے سمندر کی طرف دیکھا اور اپنے آپ سے کہا:

"چلو، ذرا پل پر چلیں۔"

"ضرور چلیے صاحب"۔ میں نے خود ہی جواب دیا اور پُل کی طرف چل دیا۔ راستے میں مالٹے کا ایک چھلکا دیکھا، جُھک کر اُسے اُٹھالیا اور چبانے لگا۔ مجھے اپنے حلق میں تلخی سی محسوس ہوئی۔ پُل پر بہت سے لوگ بسکٹ بیچ رہے تھے۔ کچھ دیر میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ اتنے میں چار بج گئے۔ میں پھر رینگتا ہوا اخبار کے دفتر کی طرف بڑھا۔ دفتر بند ہو چکا تھا۔ سیڑھیوں پر بیٹھ کر میں احمقوں کی طرح سڑک پر گزرنے والے لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک مجھے اپنے کوٹ کے بٹنوں کا خیال آیا۔ میں نے فوراً چاقو سے بٹن اُتار لیے اور تیز قدموں سے "پچا سورس" کی طرف چلا۔ یکایک مجھے اپنے آپ پر غصّہ آگیا۔ میں ذلالت کی گہرائیوں تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سزا دینے کی ٹھان لی۔ میں ایک سڑک کے بعد دوسری سڑک کو پیچھے چھوڑتا چلا گیا۔ میرے منہ سے دبی دبی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ ایک جگہ پہنچ کر میں رک گیا۔ مزید چلنے کی سکت نہیں تھی اور سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ سوچنے لگا کہ میں نے اپنے آپ کو کس جُرم میں سزا دی ہے۔ میں تھکا ہوا اور کمزور تھا، اس لیے رونے لگا۔ تھوڑی دیر تک آنسو بہانے سے میرا جی کچھ ہلکا ہو گیا۔ میں نے ایک خالی ماچس اُٹھائی اور اسے چبانے لگا۔ اچانک مجھے کمبل کا خیال آیا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے میں کمرے کی طرف لپکا اور چشم زدن میں کمبل اٹھا لایا۔ تھوڑی دیر بعد میں پچاسورس کے سامنے تھا۔ اس نے پہلے کمبل کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر نفی کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا:

"یہ میرے کسی کام کا نہیں، ایسے ہزاروں کمبل میرے پاس بھرے پڑے ہیں، انھیں کوئی نہیں خریدتا۔"

میں نے منتیں کیں، ہاتھ جوڑے، لیکن اس نے میری ایک نہ مانی۔ میں نے کمبل اٹھایا اور واپس کمرے میں لے جا کر رکھ دیا۔ اچانک مجھے اپنے فعل کی قباحت کا احساس ہوا۔ میں نے کس قدر بیہودہ کام کیا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر تھپڑ مارے اور سر کو دیوار سے ٹکرانے لگا۔ آخر میں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ میں تو کمبل کو گروی کرنا چاہتا تھا۔ دو چار روز بعد مجھے رقم مل جاتی، تو میں اُسے چھڑا لیتا۔ میں اسی طرح سڑک پر پھسلتا رہا۔ میرے پاؤں مَن مَن بھر کے ہو رہے تھے۔ میں نے اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیرا، وہ پچک گئے تھے۔ میں بہت دُبلا ہو گیا تھا۔ آنسوؤں اور چیخوں کے ساتھ میں نے بجلی کے کھمبے کے ساتھ اپنا سر ٹکرایا۔ میں مرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی زبان کو دانتوں سے کاٹ لیا۔ میری ٹانگوں پر پھنسیاں نکل آئی تھیں۔ میں نے ان میں ناخن چبھو دیے۔ ان میں سے خون اور پیپ نکلنے لگی۔ میں گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا اور خدا سے دعا مانگنے لگا کہ وہ مجھے موت دے دے۔ آخر مجھ پر بھوک غالب آ گئی۔ میں نے ایک دکان میں داخل ہو کر ہاتھ پھیلا ہی دیا، لیکن وہاں سے مجھے ٹکا سا جواب مل گیا۔ ایک دوسرے دکان دار نے مجھے دھتکار کر نکال دیا۔ بھوک سے میرا دم نکلا جا رہا تھا۔ میں ایک مریل سے کتے پر جھپٹ پڑا، تاکہ کوئی ہڈی مل سکے، لیکن وہ مجھ سے بہت صحت مند نکلا اور ہڈی کو منہ میں رکھ کر بھاگ نکلا۔ میں نے اپنے پیٹ میں انگلیاں گاڑ دیں تاکہ ٹیس شدت نہ پکڑ جائے۔ دفعتہً مجھے اپنے بٹنوں کا خیال آیا۔ میں نے دوبارہ چچا کی دکان کا رخ کیا، لیکن چچا نے بٹن لینے سے انکار کر دیا۔

" معلوم نہیں وہ انکار کیوں کر رہا ہے؛ حالانکہ بٹن تو بالکل نئے ہیں"۔

میں بڑبڑاتا ہوا دکان سے باہر نکل رہا تھا کہ ایک شناسا صورت سے ٹکر ہو گئی۔

" کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے"؟

میں خاموش رہا۔

" میں اپنی گھڑی فروخت کرنے جا رہا ہوں، تم یہیں ٹھہرو"۔

میں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میرے ہاتھ پر پانچ شلنگ رکھ دیے گئے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

ایک ہفتہ خوشی خوشی گزر گیا۔ میں نے ساتوں دن ڈٹ کر کھایا اور بیک وقت چار مضمون لکھتا رہا۔ آٹھویں دن میں مضمون لے کر ایڈیٹر کے پاس گیا، اس نے شام کے وقت آنے کے لیے کہا۔ چار بجے کے قریب میں پھر دفتر میں داخل ہوا۔

"معاف کیجیے مسٹر، آپ کے چاروں مضمون ناقابلِ اشاعت ہیں، آپ انھیں لے جا سکتے ہیں۔ ویسے اگر آپ کو پیسوں کی ضرورت ہو تو پیشگی لے جائیے۔"

میں ایک لمحے کے لیے رُکا، کشمکش ہوتی رہی، دوسرے لمحے میں نے شکریہ ادا کیا اور باہر نکل آیا۔ بھلا میں اس کا احسان کیسے لیتا۔

چار دن بعد میں حسبِ معمول پھر بھوکا تھا۔ رات بھیگ رہی تھی۔ ایک سڑک پر مجھے ایک لڑکی دکھائی دی۔ میں حیران رہ گیا۔ میں یونہی اس کے قریب چلا گیا، وہ مجھے اپنی طرف گھورتے دیکھ کر بولی:۔

"شب بخیر!" میں نے جواب دیا۔ میں اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ رات گئے وہ گھر سے باہر تنہا کیوں گھوم رہی ہے، لیکن اس نے مجھے موقع نہ دیا اور میرے بازو میں اپنا بازو ڈالتے ہوئے بولی:۔

"چلو۔"

ہم چلنے لگے۔ چند قدم چل کر میں نے اُسے رُکنے کا اشارہ کیا اور اس کے کان کے پاس اپنا مُنہ لے جا کر کہا:۔

"میرے پاس ایک پیسہ تک نہیں۔"

وہ میری تلاشی لینے لگی۔ شاید اُسے میری بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"اچھا، خدا حافظ"! میں چلنے لگا۔

"ذرا ٹھہرو۔" وہ تیزی سے بولی۔ "تمھاری عینک کا فریم سونے کا ہے؟"

"نہیں۔"

"دفان ہو جاؤ، پھر میرا مُنہ کیوں تک رہے ہو؟"

"بہت بہتر میں جا رہا ہوں، لیکن ایک بات غور سے سُن لو، اِس گناہ آلود زندگی سے باز آجاؤ۔"

یہ کہہ کر میں چل دیا۔ میں بہت خوش تھا، شاید اس لیے کہ میں نے اپنی دانست میں اُسے گناہ سے بچنے کی ترغیب دی تھی۔

میں چابیوں کے گچھے کو چھنکاتا رہا اور موم بتی حاصل کرنے کے طریقوں پر غور کرتا رہا۔ سڑک کے لیمپ کے نیچے کام بھی کیا جا سکتا ہے، یہ سوچ کر میں خوش ہو گیا۔ لکھنے کا سامان زمین پر رکھ کر میں لیمپ کے عین نیچے بیٹھ گیا۔ دور ایک کانسٹبل کے نخدسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں دیر تک سوچتا رہا، لیکن ذہن نے ساتھ نہ دیا۔ سردی سے میرا سارا جسم منجمد ہو گیا تھا۔ آخر میں اٹھا اور

کمرے کی طرف چل دیا۔ بستر پر پہنچ کر مَیں ہاتھوں سے اپنے پیروں کو گرم کرنے لگا۔ صبح اُٹھ کر میں کمرے میں ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ میں نے دیوار کو ناخنوں سے کھرچا، فرش پر انگلیاں بجائیں، غرضیکہ ہر طریقہ سے اپنے آپ کو مضمون لکھنے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی، لیکن ناکامی ہوئی۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ باہر سڑکوں پر گھوڑے چل رہے تھے۔ میرا سینہ جل رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تاریکی میں ڈوبتا چلا جا رہا ہوں۔ میری انگلیاں سخ ہو رہی تھیں۔ انھیں گرم کرنے کے لیے میں سر کے بالوں میں پھیرنے لگا، تو میرے سر سے چند بال اکھڑ کر فرش پر گر پڑے۔ مَیں نے اُس کی ذرہ برابر پروانہ کی۔ ابھی میرے سر پر خاصے بال موجود تھے۔ پھر مَیں نے اپنے گھٹنوں پر چانٹے مارے تاکہ جسم قدرے گرم ہو جائے۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں مر رہا ہوں۔ میں خالی نظروں سے چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے کچھ کھائے ہوئے آٹھ دن ہو چکے تھے۔ میں نے اپنی انگلی مُنہ میں لے لی اور اُسے چوسنے لگا۔ دفعتہً ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔ اگر میں اپنی انگلی کاٹ کھاؤں۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پوری قوت سے دانت بھینچ لیے۔ درد کی شدت سے مَیں اچھل پڑا۔ انگلی سے خون ٹپک رہا تھا۔ مَیں یہ خون چوسنے لگا اور پھر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو اُمنڈ پڑے۔ میں نے اپنا خون پینا بند کر دیا اور کھڑکی کے پاس جا کر انگلی کو غور سے دیکھا۔ درد بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ میں نے فرش پر سے ایک چیتھڑا اُٹھایا اور اُسے انگلی کے گرد لپیٹ لیا۔ اس وقت مجھے اپنی انگلی پر ترس رہا تھا۔

کچھ سوچ کر میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور پنسار کی دکان کی طرف چل دیا۔ اچھے دنوں میں مَیں اس سے ڈبل روٹی خرید ا کرتا تھا۔ کیا اب وہ مجھے ایک موم بتی بھی ادھار نہ دے سکے گا۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ اگر میں ایک ڈبل روٹی بھی مانگ لوں تو کیا حرج ہے، لیکن میں نے فوراً ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ممکن ہے اس طرح وہ خفا ہو جائے اور موم بتی دینے سے انکار کر دے۔

میں نے ایک موم بتی طلب کی اور قیمت بعد میں ادا کرنے کے بارے میں اچھے اچھے فقرے سوچ رہا تھا کہ دکاندار نے میرے ہاتھ پر نو شلنگ اور کچھ ریزگاری رکھ دی۔ میں ایک لمحے کے لیے سکوں کی طرف دیکھتا رہا اور پھر غیر ارادی طور پر انھیں اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ دروازے میں پہنچ کر مَیں رُک گیا۔ مَیں دکاندار سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میری زبان نے ساتھ نہیں دیا۔

"خوب کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے!" دکاندار مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں، اس مرتبہ سردی کچھ زیادہ ہی پڑ رہی ہے!" میں نے جواب دیا اور پھر میں غور کرنے لگا کہ یہ جملے کیا واقعی میں نے ادا کیے تھے۔ مَیں باہر کی طرف چل دیا۔ ابھی مَیں سڑک پر پہنچا ہی تھا کہ دکاندار کی

آواز سنائی دی۔ میں نے ریزگاری مٹھی میں پکڑلی تاکہ اُسے لوٹا سکوں۔

"اپنی موم بتی تو لیتے جائیے۔"

اُس نے موم بتی میری جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا اور میں مُنہ سے ایک لفظ نکالے بغیر آگے بڑھ گیا۔ ایک کھمبے کے نیچے رک کر ریزگاری کو ہاتھوں سے چھوا اور پھر قریب ہی ایک ہوٹل میں گھُس گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں درندوں کی طرح گوشت چبا رہا تھا۔ ہر لقمہ نگلتے وقت پانی کا ایک گھونٹ پیتا تاکہ جلدی سے دوسرا لقمہ مُنہ میں ڈال سکوں۔ میں نے پیٹ بھر کھانا کھایا اور قہوے کی ایک پیالی پی کر باہر آگیا۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ اچانک میرے پیٹ میں شدّت سے ٹیس اٹھی اور مجھے قے آگئی۔ میرا جی بُری طرح متلا رہا تھا۔ میں نے اپنی مٹھیاں مضبوطی سے بند کرلیں اور اپنی آنکھوں میں اُمنڈتے ہوئے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک میرے ذہن میں دوڑنے کا خیال پیدا ہوا اور میں اندھا دھند سڑک پر دوڑنے لگا۔ میں نے سوچا تھا شاید اس طرح وہ کھانا ہضم ہو جائے جو میرے پیٹ میں کھدبد کر رہا تھا، لیکن میں اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک موڑ پر میں گر پڑا اور وہ سب کچھ میرے پیٹ سے نکل گیا جس کے لیے میں اتنے دنوں سے بے چین پھر رہا تھا۔ اس حالت میں میں نے ایک آدمی کو دیکھا جو میری طرف حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کیوں صاحب، ایک ایسے شخص کو جو کئی دنوں سے بھوکا ہو کیا کھانا چاہیئے؟" میں نے اُس سے سوال کیا۔

"میں نے سنا ہے کہ ایسے شخص کو دودھ پینا چاہیے۔ آخر وہ شخص ہے کون؟"

کوئی جواب دیے بغیر میں ایک قہوہ خانے کی طرف بھاگ نکلا۔ گرم دودھ کا ایک پیالہ پی کر میں نے گھر کا راستہ لیا۔

دوسرے دن جب میری آنکھ کھُلی تو زوروں سے برف باری ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چاقو کی طرح میرے جسم کو کاٹ رہی تھی۔ بیئر کا ایک گلاس پی کر میرے اعصاب ذرا ٹھکانے آئے۔ میں اپنی رذالت کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے اپنی چوری یاد آئی اور ساتھ ہی چور کی سزا میرے ذہن کے سامنے لہرا گئی۔ پولیس چوروں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیتی ہے اور پاؤں میں بیڑیاں اور پھر اسے اندھیری سی کوٹھری میں ڈال دیا جاتا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو ایک اندھیری کوٹھری میں بند ہوتے دیکھا اور وہ رقم جو میری جیب میں تھی، مجھے بوجھل محسوس ہونے لگی۔ میں نے اپنے آپ کو گنہگار سمجھتے ہوئے زور زور سے ہاتھ ملنے شروع کر دیے۔ میرا یہ احساس شدت پکڑنے لگا کہ میں دکاندار سے

وہ رقم لے کر بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟ میں نے سوچا۔ میں کوئی ایسا طریقہ تلاش کر رہا تھا جس سے میرا گناہ دُھل جائے اور میں پھر سے پاک ہو سکوں۔ مجھے محسوس ہوا کہ جب میں بھوکا تھا، تو اتنا پریشان نہیں تھا جتنا کہ اب ہوں اور پھر غیر ارادی طور پر میرے قدم کیک فروخت کرنے والی اس غریب بڑھیا کی طرف بڑھنے لگے جو بازار کے وسط میں ہجوم سے بے پرواہ زمین پر بیٹھی تھی۔ میں نے پیسے مُٹھی میں دبائے اور چپکے سے اس کے ہاتھ پر رکھ کر تیز قدموں سے اپنے راستے پر ہو لیا۔ ایک بار پھر سے ایماندار بننے پر مجھے ایک نامعلوم سی تسکین محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سر سے منوں بوجھ اُتر گیا ہے۔ دیر تک میں خوشی خوشی سڑکوں پر پھرتا رہا۔ میری حالت ایک بدمست جانور کی سی تھی جو اچھی طرح پیٹ بھرنے کے بعد ڈکاریں لے رہا ہو۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں پنساری کی دکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ دکاندار میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"آج موسم اچھا نہیں۔"

"موسم پر بحث کرنے کے لیے مَیں نہیں آیا۔" میں نے جھلا کر کہا۔

وہ حیران نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ مَیں نے ایک ہی سانس میں اُسے اپنی چوری سُنا دی۔

یہ تو تم نے واقعی کمینگی سے کام لیا ہے۔"

میں نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور سر جُھکا کر گھر کی طرف چل دیا۔

صبح جب میری آنکھ کُھلی تو میرا سارا جسم پسینے میں نہا چکا تھا۔ میرا جسم بری طرح تپ رہا تھا۔ شاید مجھے بخار نے آن لیا تھا۔ بستر سے اُٹھ کر میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ مجھے زوروں کی بھوک لگی ہوئی تھی۔ مَیں نے پھٹے بوٹ پہنے اور باہر نکل گیا۔ دیر تک میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔ دوپہر تک میری حالت بہت ابتر ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے کوٹ کی جیب پھاڑی اور اُسے دانتوں سے چبانے لگا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کسی قصائی سے گوشت کا ایک آدھ ٹکڑا مانگ لوں۔ میں گھسٹتا ہوا بازار کی طرف چلا۔ گوشت کی دکان کے سامنے پہنچ کر میں رُک گیا۔

"کیا آپ میرے کُتے کے لیے ایک ہڈی دے سکتے ہیں؟" صرف ہڈی چاہیئے میں گوشت نہیں مانگ رہا۔"

مجھے ہڈّی مل گئی اُسے کوٹ میں چھپا کر مَیں ایک تنگ گلی میں گھس گیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر اُسے بھنبھوڑنے لگا۔ یہ بے ذائقہ تھی اور اس میں سے خون کی بدبو آ رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے مجھے قے آ گئی۔ میں نے

گوشت کے اس ٹکڑے کو دوبارہ نگلنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ بار بار میری نگاہ گوشت کے اس چھوٹے ٹکڑے پر پڑتی جو کیچڑ میں پڑا تھا۔ میں دیوانوں کی طرح چیخنے لگا اور اس ٹکڑے کو اٹھا کر نگلنے کی کوششیں کرنے لگا۔ اچانک مجھے کھانسی آنی شروع ہو گئی اور میں بیمار کتے کی طرح کھانستے ہوئے زمین پر گر پڑا۔

تین دن اور گزر گئے۔ میں دن بھر بازار میں گھسٹتا اور رات کو نم آلود فرش پر پھٹا پُرانا کمبل اوڑھ کر سونے کی کوشش کیا کرتا۔ پانچویں روز میری حالت پتلی ہو گئی اور آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ میں نے انھیں کھلا رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ میں نے آخری بار ہمت کی اور بمشکل گھسٹتا ہوا باہر نکلا۔ پارک تک پہنچتے پہنچتے میرا سانس پھول گیا۔ میں بے حال ہو کر گھاس کے خشک تختے پر گر پڑا اور دونوں ہاتھوں سے سر چھپا کر رونے لگا۔

اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ ایڈیٹر میرے سامنے کھڑا تھا۔

"یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

میں خاموش رہا۔

"معلوم ہوتا ہے تم نے کئی روز سے کچھ نہیں کھایا۔ اس طرح تو تم اپنی جان دے دو گے۔"

یہ کہہ کر اُس نے میری ہتھیلی پر کچھ رقم رکھ دی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی لیکن نقاہت کی وجہ سے الفاظ میری زبان سے نہ نکل سکے۔

گرم دودھ کا ایک گلاس پینے کے بعد میں ٹہلتا ہوا بندرگاہ کی طرف چلا گیا۔ ایک جہاز سفر کے لئے تیار تھا۔ ایک آدمی جو لباس اور شکل وصورت سے کپتان معلوم ہوتا تھا بندرگاہ پر بڑی تیزی سے ادھر ادھر پھر رہا تھا۔ میں نے قریب پہنچ کر ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔

کیوں جناب، آپ کب سفر کر رہے ہیں؟

"بس ابھی چلنے ہی والے ہیں۔"

"آپ کو کسی آدمی کی ضرورت تو نہیں؟"

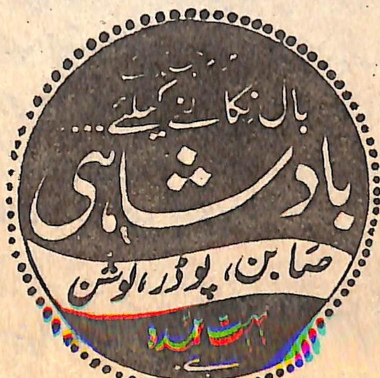
"ایسی خاص ضرورت تو نہیں، لیکن اگر کوئی موٹا تازہ جوان آدمی ہو، تو اُسے رکھا بھی جا سکتا ہے۔"

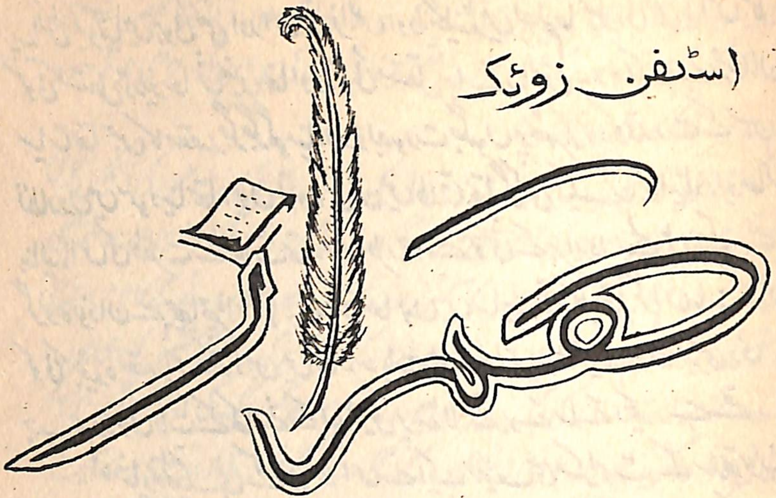
میں نے اپنے کمزور جسم پر ایک نگاہ ڈالی اور کندھے جھٹکاتے ہوئے کہا۔

"میرے متعلق کیا خیال ہے؟ میں ہر کام کر سکتا ہوں"۔

"ٹھیک ہے"۔ کپتان نے میری طرف تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں جہاز کے عرشے پر کھڑا تھا۔ میں نے غور سے کرسچینا کے شہر کی طرف دیکھا جہاں میں نے بھوک اور افلاس کے باوجود ایک پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی۔ ممکن کوشش کی تھی۔ اُس وقت مجھے اُس کے گھروں کی روشنیاں مدھم پڑتی ہوئی دکھائی دیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سارا شہر اتھاہ تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔ پھر میں نے کھلے سمندر کی طرف دیکھا اور مجھے یوں جیسے اس جھاگ اڑاتے ہوئے پانی کو عبور کر کے میں جس جگہ پہنچوں گا وہاں روشنیاں ہی روشنیاں ہوں گی۔





(ترجمہ :- محمد یعقوب فاروقی)

میں پچھلے گرمی کے موسم میں ایک ماہ کیڈنیبیا میں گزارنے کی غرض سے گیا جو کوموجھیل کے کنارے واقع ہے۔ وہاں پیڑوں کے جھرمٹ میں چھوٹی چھوٹی صاف ستھری کیبن نہایت دیدہ زیب ہیں۔ یہ جگہ بہار کے دنوں میں طرح طرح کے لوگوں سے بھری رہتی ہے۔ مگر اگست کے گرم دنوں میں یہاں بڑی حد تک ویرانی تھی۔ ہوٹل کے بیشتر کمرے بھی خالی تھے۔ وہاں قیام کرنے والے لوگ ہر صبح ایک دوسرے کو اس امید پر دیکھتے تھے کہ شاید اب کوئی نووارد بھی شامل ہو گیا ہو۔ جہاں تک میرا تعلق تھا میں ایک معمّر آدمی کو دیکھ کر اکثر محو حیرت رہا کرتا تھا جو اپنی چال ڈھال، کپڑوں اور وضع قطع سے کافی عجیب معلوم ہوتا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ وہ شخص آخر سمندر کے کنارے تفریح کرنے کیوں نہیں جاتا۔ اپنے وقت کا بیشتر حصہ وہ سگریٹ پینے اور اس کے ابھرتے ہوئے مرغولوں کو دیکھنے میں گزارتا تھا اور بقیہ وقت کتابوں کے مطالعے میں صرف کیا کرتا تھا۔ چند دنوں بعد برسات کا موسم شروع ہوا اور ہم دونوں کا تعارف ہو گیا۔ کچھ دنوں میں وہ مجھ سے اس طرح گھل مل گیا کہ ہماری عمر کا فرق بالکل ختم ہو گیا اور ہم دونوں ایک دوسرے کے بے تکلف دوست بن گئے۔ اس کی

پیدائش لیوتنیا میں ہوئی تھی اور اس نے فرانس اور انگلینڈ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کا
کوئی مستقل ذریعہ معاش نہیں تھا اور نہ کوئی مستقل جائے رہائش۔ وہ ایک بے سروسامان
سیاح تھا جس کا مقصد جگہ جگہ گھومنا اور خوبصورت جگہوں پر ٹھہر کر خود کو قدرت کے حسین
نظاروں میں سمو دینا تھا۔ یوں تو وہ کئی فن میں طاق تھا مگر کسی ایک فن کو اپنا ذریعہ معاش
بنالینا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ اس طرح اسے خوشی کے ہزاروں لمحے مل سکتے تھے
مگر وہ خود ان سے پیچھا چھڑا تا رہا۔ وہ اکثر معاملوں میں نہایت تجربہ کار تھا مگر اس بات کا بھی
کوئی سنجیدہ مقصد اس کے ذہن میں نہ تھا۔ یہ بات میں نے اس سے ایک دن کہہ بھی دی۔
جب ہم دونوں رات کے کھانے کے بعد جھیل پر منڈلاتے ہوئے سائے دیکھ رہے تھے۔
"شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو" اس نے ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔
"پرانی یادوں میں مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ تجربہ زندگی میں صرف ایک بار
ہوتا ہے اور بس مگر ہاں اس کے اثرات وقت کے ساتھ مندمل نہیں ہوتے اور وہ بیس تیس
پچاس یا سیکڑوں سال کے بعد بھی مٹ نہیں پاتے۔ میں تمہیں ایک ایسا واقعہ سنانا چاہتا ہوں
جو ایک خوبصورت کہانی کا موضوع بن سکتا ہے۔ آؤ ہم لوگ کچھ دور تک ٹہلتے ہوئے چلیں چہل قدمی
کرتے وقت میں زیادہ اچھی طرح بات کر سکتا ہوں"
ہم لوگوں نے جھیل کے کنارے ٹہلنا شروع کیا۔ وہاں چاروں طرف اخروٹ اور
سرو کے اونچے اونچے پیڑ تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا کی وجہ سے جھیل کی لہریں بڑی دلکش معلوم ہو
رہی تھیں۔
"پہلے مجھے ایک بات کا اعتراف کرنے دو۔ پچھلے سال اگست کے مہینے میں
بھی میں یہاں آیا تھا اور اسی ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ تمہیں یہ سن کر تعجب ضرور ہوگا کیونکہ میں
تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ کسی بات کو بار بار دہرانا مجھے پسند نہیں ہے۔ مگر جب تم میری
کہانی سنوگے تو میری مجبوری سمجھ سکوگے"
یہ جگہ پچھلے سال بھی اسی طرح ویران تھی۔ میلان کا ایک شخص یہاں ٹھہرا ہوا تھا
وہ اپنا زیادہ وقت جھیل کے شکار میں گزارتا تھا اور شام کو اپنے کانٹے سمیٹ کر چلا جا
دوسرے دن پھر وہ یہی کرتا تھا۔ دو انگریز بھی تھے مگر وہ لوگ اتنے خاموش رہتے تھے

کہ ان کی موجودگی کا علم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور دُبلا پتلا شخص تھا اس کے ساتھ ایک دُبلی پتلی اور ٹُبک سی عورت تھی جو غالباً اس کی بیوی ہوگی۔ جو بھی ہو گر وہ ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔

"آخری حصّہ میں ایک جرمن خاندان تھا۔ ایک دُبلی اور معمّر عورت جس کی آنکھیں گہری نیلی تھیں۔ دوسری عورت جو غالباً اس کی بہن ہوگی اس لئے کہ دونوں کی صورت بہت ملتی تھی۔ دونوں عورتیں عام طور پر ایک ساتھ نظر آتی تھیں اور خاموشی سے سینے پرونے کے کام میں مشغول رہتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے دماغ کے خلاء کو پر کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ان کے ساتھ سولہ سترہ سال کی ایک لڑکی تھی جو دونوں میں سے کسی ایک کی اولاد ہوگی۔ اس کے خدوخال کافی دلکش تھے اور جوانی سے بچپن کے گلے ملنے کے آثار نمایاں تھے۔ وہ نہایت سادہ سی لڑکی تھی اور اس کے چال ڈھال میں کافی الہڑپن نظر آتا تھا۔ لباس وغیرہ بھی زیادہ نمائشی نہ تھے اور اس کی صورت بھی بڑی بھولی تھی۔

لڑکی کی آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں اور اس میں ایک انوکھی چمک تھی۔ مگر وہ فطرتاً اس قدر شرمیلی واقع ہوئی تھی کہ کسی سے آنکھ ملانے کی ہمت بھی نہ رکھتی تھی۔ اپنی ماں اور خالہ کی طرح اس کا بھی مشغلہ سینا پرونا تھا۔ مگر وہ ان کی طرح زیادہ مصروف نظر نہیں آتی تھی۔ اکثر وہ اپنا ہاتھ روک کر خاموش بیٹھ جاتی اور خواب آلود نگاہوں سے جھیل کو دیکھا کرتی۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ اس کی یہ انوکھی ادا مجھے اتنا کیوں بھاتی تھی۔ کیا یہ ایک بے مقصد اثر تھا جو بوڑھی ماں کی نوجوان لڑکی میں موجود تھا، یا اس کی آنکھوں میں کوئی انوکھا سپنا تھا جو اس عمر کی ہر لڑکی دیکھتی ہے۔ یا اسے اپنے خوابوں کے شہزادے کا انتظار تھا یا اسے کسی ایسی تخلیق کا انتظار تھا جو اس کے رگ و پے میں ایک نئی زندگی بھر سکے۔ بہر حال وجہ جو بھی ہو اس کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنا میرے لئے بڑا دردناک تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے دل میں خواہشات کا ایک طوفان برپا ہو، یہ بات اس کی بے چین آنکھوں سے صاف ظاہر تھی۔ وہ اپنے لطیف جذبات کسی سے بیان کرنا چاہتی تھی مگر اس کے آس پاس کوئی ایسا ہمراز نہ تھا۔ وہ خود کو اس وقت اور بھی تنہا محسوس کرتی جب وہ دونوں بوڑھی عورتوں کے پاس بیٹھ کر خود کو مشغول رکھنے کی کوشش

کرتی۔ میرے دل میں اس کے لئے بڑی ہمدردی پیدا ہوگئی گر میں پیش قدمی کرنا مناسب نہیں
سمجھتا تھا۔ اس قدر کم عمر لڑکی بھلا مجھ جیسے معمّر شخص میں کیا دلچسپی رکھ سکتی تھی ؟۔ لڑکی کے
کے علاوہ اس کے خاندان سے تعلقات پیدا کرنا میری فطرت کے خلاف تھا۔ خاص کر
بوڑھی عورتوں سے میں یوں بھی گھبراتا ہوں۔

میرے دماغ میں ایک انوکھے خیال نے انگڑائی لی، میں نے سوچا یہ بیچاری ناتجربہ کار
لڑکی ہے جس نے ابھی حال ہی میں اسکول چھوڑا ہوگا۔ الہڑ اور بھولی بھالی۔ جرمن لوگ
شیکسپیر بڑے شوق سے پڑھتے ہیں اور بھلا ہو شیکسپیر کا (جو بیچارہ کبھی اٹلی نہیں گیا) اس بیچاری
کے لئے یہ جگہ محبت اور رومان کے دیس سے کم نہ ہوگی۔ رومیو کا دیس، محبت کی وادی
رنگین فضاؤں کا جمگھٹ ــــ یقینی طور پر وہ ان باتوں کا خواب دیکھتی ہوگی۔ معصوم لڑکیوں
کے خواب کی سرحد ہی کیا ہے ؟ سفید اور نیلے بادلوں کے سائے، سنہرے سپنے، رنگین
شام۔ اس کے لئے بھلا ناممکنات کا کیا وجود۔ میں نے سوچا کہ مجھے اس کے لئے کوئی محبوب
تلاش کرنا چاہیئے۔

اسی رات میں نے ایک طویل خط لکھا، نرم و نازک الفاظ میں محبت سے بھرپور
خط۔ یہ خط جرمن زبان میں لکھا گیا تھا۔ گر میں نے جملوں کی ترتیب اور لوچ کا خاص خیال
رکھا تھا۔ خط میں کہیں لکھنے والے کا نام نہیں تھا۔ لکھنے والے نے نہ اس سے کسی بات
کی تمنّا کی تھی اور نہ کوئی چیز ہی پیش کی تھی۔ یہ ایک قسم کا رومانی خط تھا جو عام طور پر ناولوں
میں نظر آتا ہے۔ یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ سب سے پہلے وہ ہی کمرے میں داخل ہوتی
ہے اس لئے میں نے خط کو تہ کر کے اس کی میز پر رکھ دیا۔

دوسری صبح باغ میں بیٹھ کر میں نے اس کے ردِّ عمل پر غور کرنا شروع کیا۔ کھڑکی سے
جھانک کر دیکھنے پر مجھے اس کے ناقابلِ یقین تعجب کا اندازہ ہوا۔ وہ حد درجہ حیرت زدہ
تھی اور اس کے رخسار پر ایک نئی سرخی کی لکیر نمایاں تھی۔ وہ چاروں طرف عجیب انداز
میں نظریں دوڑا رہی تھی۔ ناشتے کے دوران بھی وہ بڑی بےچین رہی اور بڑی مشکل سے
چند لقمے حلق سے اتار سکی۔ اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ وہ جلد از جلد کسی سنسان گلی میں
پہنچ کر اس عجیب و غریب خط کے مطلب پر غور کر سکے۔

میں بیچ ہی میں بول پڑا۔" آپ نے عجیب خطرہ مول لیا۔ کیا آپ نے اسطرف کوئی دھیان نہیں دیا کہ کہیں وہ لوگوں سے اس بارے میں پوچھ نہ بیٹھے۔ اور بیرے سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ یہ خط اس کی میز تک کیسے پہونچا۔ یا کہیں وہ یہ خط اپنی ماں کو نہ دکھا دے۔"

"یقیناً میں نے ان تمام باتوں پر غور کر لیا تھا۔ اگر تم اس لڑکی کو دیکھ لیتے تو تمہیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا کہ وہ کتنی کم گو اور شرمیلی تھی اور تب تمہیں ان تمام باتوں کی کوئی فکر نہ ہوتی۔ کچھ نوجوان لڑکیاں اتنی شرمیلی ہوتی ہیں کہ کوئی مرد بڑی بے باکی سے سب کچھ کر گزر سکتا ہے اور وہ ان تمام باتوں کو برداشت کر لیں گی۔ اس لئے کہ وہ شکایت کرنے کی ہمّت نہیں رکھتیں۔"

بڈھے نے پھر اپنی داستان جاری رکھی، اپنی ترکیب کارگر ہوتی دیکھ کر میں بہت خوش تھا۔ وہ کچھ دیر باغ میں ٹہل کر واپس آئی اور میری رگ رگ میں عجیب سی بے قراری پیدا ہو گئی۔ اب وہ ایک بدلی ہوئی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی چال میں عجیب سا لوچ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ خود کو کس طرح سپرد کر دے یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس کے رخسار پر ایک انوکھی چمک تھی۔ دن بھر وہ اسی طرح بیقرار رہی۔ ہر کھڑکی پر نظر دوڑاتی تاکہ اس عجیب معمے کا حل تلاش کر سکے۔ وہ ہر راہ چلنے والوں کو بھی مشتبہ نظروں سے دیکھتی۔ ایک بار تو اس کی نگاہیں مجھ سے بھی ٹکرائیں۔ میں نے جان بوجھ کر نگاہیں جھکالیں کہ کہیں میری آنکھوں سے کوئی راز ظاہر نہ ہو جائے۔ اسی لمحے مجھے اس بات کا اندازہ بھی ہوا کہ اس کے سینے میں تجسّس کا ایک طوفان برپا ہے۔ یہ خیال میرے لئے بڑا ہی پریشان کن تھا کیونکہ میرا تجربہ یہ ہے کہ مرد کی زندگی میں اس سے زیادہ گمراہ کن لمحہ کبھی نہیں ہوتا جب وہ کسی لڑکی میں اس قسم کے جذبات پیدا کرتا ہے۔

جب وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھی تب بھی میں نے اس پر نظر رکھی اور یہ دیکھتا رہا کہ بار بار غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھ اسی جگہ پہنچے جہاں اس نے خط چھپا رکھا تھا۔ اب اس کھیل میں میری دلچسپی اور بڑھ گئی۔ اسی شام میں نے دوسرا خط لکھا اور اسی طرح ہر رات ایک خط لکھتا رہا۔ اب میرے لئے ہر خط میں محبت کے نئے اور لطیف جذبات کا سمونا مشکل سا معلوم ہونے لگا۔ "کھیل کے جال جو بچھاتا ہے اس کے جذبات کم و بیش ویسے ہی ہو جاتے ہیں۔"

کبھی کبھی اس سنجیدہ مذاق سے میری طبیعت بھر جاتی اور میں دل میں اس کھیل کو ختم کر دینے کا ارادہ کر لیتا۔ لیکن دوسری طرف اس کا انوکھا انجام دیکھنے کی تمنا بھی دل میں جاگ اٹھتی۔

اب اس کی چال میں رقص کا سا انداز پیدا ہو چلا تھا اور اس کو خود کو سنوارنے کا سلیقہ بھی آ گیا تھا اور وہ ساری رات شاید دوسری صبح آنے والے محبت نامے کے انتظار میں جاگ کر گزارتی۔ اس کی آنکھ کے گرد سیاہ حلقوں کو دیکھ کر اس کی شب بیداری کا پتہ چلتا تھا اب اس نے اپنے بناؤ سنگھار پر بھی کافی توجہ دینی شروع کر دی تھی اور بالوں میں پھول لگانا بھی شروع کر دیا تھا۔ کسی چیز کو ہاتھ لگاتے وقت وہ بڑی نزاکت دکھاتی اور اس پر عجیب انداز سے نظریں ڈالتی جیسے کوئی اس کی ہر حرکات کو دیکھ رہا ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے خطوط میں یہ ظاہر کیا تھا کہ اس کا محبوب قریب ہی رہتا ہے اور اس کی ساری باتوں پر نظر رکھتا ہے مگر مصلحتاً سامنے آنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اب اس کے طور طریقے میں اتنا نمایاں فرق پیدا ہو گیا تھا کہ اس کی ماں اور خالہ کو بھی اس بات کا اندازہ ہونے لگا۔ انھوں نے بھی اس کے عارض پر کھلتے ہوئے گلاب اور ہونٹوں کے چھلکتے ہوئے ساغر دیکھ لیے تھے۔ اس کی آواز میں اب بڑا ٹھہراؤ اور اعتماد جھلکنے لگا تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ ابھی ابھی گنگنا اٹھے گی۔ ـــ " مگر تم مسکرا کیوں رہے ہو ـــ ؟

" نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ۔" میں نے معذرت کی ـــ " میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ آپ نے کس خوبصورتی سے معاملہ نبھایا۔ آپ کا سارا انداز کسی کہنہ مشق ناول نگار کا سا تھا ۔"

" شاید تمہارا مطلب یہ ہے کہ مجھ میں بھی جرمن ناول نگاروں کا سا رکھ رکھاؤ ہے جو زیادہ ترجذبات سے مغلوب ہو کر ناقابل فہم ہو جاتے ہیں۔ میں مختصر طور پر یہ کہوں گا کہ وہ اب میرے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گئی تھی۔ جس کی ڈور میرے ہاتھ میں تھی۔ میں جس طرح چاہتا اسے نچاتا تھا اور خود کو اس کے شبہ سے دور رکھنے کے لئے (اس لئے کہ وہ اکثر مجھے بھی مشکوک نگاہوں سے دیکھتی تھی) میں نے خطوط میں ظاہر کیا تھا کہ دراصل اس کا محبوب اس جگہ نہیں بلکہ قرب وجوار کے کسی قصبے میں رہتا ہے اور ہر شام اسٹیمر میں بیٹھ کر وہاں ٹہلنے آتا ہے۔ اسی لئے جب کسی اسٹیمر کی گھنٹی بجتی تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اپنی ماں اور خالہ کی

نظروں سے دور ہو جاتی اور اسٹیمر سے اترنے والے ہر مسافر کو بڑے غور سے دیکھتی۔

ایک دن ــــ غالباً دوپہر کا وقت تھا، میں اس وقت بھی اس پر نگاہ جمائے تھا ایک عجیب بات ہوئی۔ اُن مسافروں میں ایک نوجوان جو خوش رنگ لباس پہنے ہوئے تھا اور غالباً اٹلی کا رہنے والا تھا۔ اسٹیمر سے اترا۔ اور جیسے ہی اس نے ساحل پر قدم رکھا اس کی نظریں لڑکی کی بیتاب نگاہوں سے ٹکرائیں۔ غیر ارادی طور پر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا۔ نوجوان حیران رہ گیا۔ اور اب اس کی نظر بھی لڑکی پر جم کر رہ گئی۔ فطری طور پر اس والہانہ انداز تخاطب کے جواب میں وہ بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اور وہ اس کی طرف بڑھا۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ مگر پھر چند لمحے اس خیال سے رُکی کہ شاید وہی اس کا خط لکھنے والا محبوب ہے مگر پھر گھبراہٹ میں آگے بڑھ گئی اور اپنے شانوں کو دیکھنے لگی۔ اس کے دل میں خواہش اور خوف، تمنا اور حجاب کے درمیان تصادم شروع ہو گیا۔ مگر ایسے موقعوں پر نازک جذبات کی ہی فتح ہوتی ہے۔ وہ ٹھہر گئی۔ نوجوان بھی اس ہمت افزائی پر حیران ضرور ہوا مگر پھر بھی آگے بڑھنے لگا۔ وہ اس کے بالکل قریب پہنچ گیا اور دفعتہً میرے دل میں خطرہ پیدا ہوا کہ میں نے جو پروگرام بنایا ہے اب وہ ختم ہونے والا ہے کہ ٹھیک اسی وقت اس کی ماں اور خالہ سامنے آتی ہوئی نظر آگئیں۔ ایک خوفزدہ چڑیا کی طرح وہ ان کے پاس جا کر چھپ گئی۔ وہ نوجوان بھی خاموشی سے الگ کھسک گیا، مگر دونوں نے اپنی نظروں کے انوکھے پیغام ایک دوسرے کو پہنچا دیئے۔ میں نے سوچا کہ اب اس کھیل کو یہیں ختم کر دوں مگر پھر نہ جانے کس امید پر خاموش رہا۔ اس شام میں نے اُسے ایک اور طویل خط لکھا اس کا شبہ اور بڑھ گیا۔ اب میرے ہاتھ میں دو کٹھ پتلی ڈور تھی۔

دوسری صبح ہوٹل میں کچھ گڑبڑ دیکھ کر میرا دل دہل گیا۔ دلفریب سی بے کلی کی جگہ اب لڑکی کے چہرے پر اضطراب کے آثار تھے۔ اس کے چہرے پر آنسو کے نشان تھے اس کی خاموشی غالباً اس کی سسکیوں کا پیش خیمہ تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اب اس کے چہرے پر خوشی اور اعتماد کی جھلک ہو گی۔ مگر یہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔ میں بہت رنجیدہ ہوا۔ اور اُس وقت پہلی بار مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میری کٹھ پتلی اب شاید میرے اشارے

پر نہیں ناچ سکے گی ۔ میں نے اپنی ساری توجہ یہ جاننے میں صرف کر دی کہ آخر معاملہ کیا ہے
انھیں تمام گتھیوں کو سلجھانے میں میرا تمام وقت صرف ہو گیا ۔ جب شام کو میں واپس آیا
تو معاملہ صاف تھا ۔ ان لوگوں کی میز نہیں لگی تھی اس لئے کہ وہ لوگ ہوٹل چھوڑ کر جا چکے
تھے ۔ اور اس کو بھی اپنے محبوب کو کوئی پیغام دیئے بغیر ہی جانا پڑا تھا ۔ یہی اس کی پریشانی
کی وجہ تھی ۔ وہ یہ ساری باتیں اپنی شرمیلی طبیعت کی وجہ سے ماں کو نہیں بتا سکی تھی ۔
ان لوگوں نے اسے اس کے سنہرے خوابوں کی سرزمین سے ہٹا کر ایک غیر مانوس قصبے
میں پہنچا دیا تھا ۔ مجھے کبھی وہم و گمان بھی نہ تھا کہ میری کہانی کا انجام ایسا بے ربط ہو گا ۔
میرے سامنے اب بھی اس کی آخری الوداعی نظروں کا پیغام ، اس کی دبی دبی سسکیاں اور
بے لبسی کی تصویر ہے ۔ آج بھی میں خود کو اس کی ساری پریشانی اور بے چینی کا ذمہ دار
سمجھتا ہوں ۔ جو شاید کئی سال اس کی زندگی پر منڈلاتی رہے ۔ "

اس نے اپنی کہانی ختم کر لی تھی اور اب اندھیرا ہو چلا تھا اور چاند بادلوں کے پیچھے
دمک رہا تھا ، ہم لوگ چند قدم اور چلتے رہے اور پھر میرے ساتھی نے سکوت توڑا ۔

" یہ ہے میری داستان ــــ کیا یہ کسی خوبصورت کہانی کا موضوع نہیں
بن سکتی ــــ ؟ "

" شاید میں بہت دنوں تک ایسی داستان کو نظر انداز نہ کر سکوں گا ۔ مگر یہ کہانی
کا عنوان کیسے بن سکتی ہے ۔ اس لئے کہ یہ تو صرف چند واقعات کی کڑی ہے ۔ جب لوگ
ایک دوسرے سے وابستہ کئے بغیر گزر جاتے ہیں تو پھر یہ کہانی کیسے بن سکتی ہے ۔ کہانی کا
تو کوئی انجام بھی ہونا چاہئے ۔ "

" میں تمہاری بات سمجھ گیا ، اس نے جواب دیا ۔ شاید تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ آخر اس
لڑکی کا کیا ہوا ۔ اس کی روزمرہ زندگی میں کون سا المیہ پیش آیا ۔ ؟ "

" نہیں ! میں یہ نہیں سوچ رہا ہوں " میں نے جواب دیا ۔ " مجھے لڑکی میں کوئی دلچسپی
نہیں ہے ۔ نوجوان لڑکیوں میں دلچسپی رکھنا بیکار ہے چاہے وہ خود کو کتنا ہی قابل توجہ
گمان کریں ۔ اس لئے کہ ان کے سارے تجربات دوسری طرح کے ہوتے ہیں ۔ آپ کے
داستان کی لڑکی کچھ دنوں بعد کسی معزز شہری سے شادی کر لے گی اور یہ واقعہ چند سال بعد

اس کے لئے معمولی حادثے سے زیادہ اہمیت نہ رکھے گی ۔ مجھے لڑکی کا خیال نہیں ہے"
"تم مجھے عجیب آدمی معلوم ہوتے ہو، اُس نے جواب دیا" میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نوجوان میں تمہاری کیا دلچسپی ہوسکتی ہے ۔ نظروں کی ۔ ایک دوسرے سے اتفاقی ملاقات یہ ہر نوجوان زندگی کے ادنیٰ واقعات ہیں۔ کچھ لوگ تو اس پر غور ہی نہیں کرتے اور بقیہ لوگ جذبات کے ٹھنڈے ہو جانے پر ان باتوں کو بھول جاتے ہیں۔ ان باتوں کی قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب ہم لوگ بوڑھے ہوجاتے ہیں۔ اس وقت یہ خیال آتا ہے کہ زندگی کے سب سے بیش قیمت لمحات وہی تھے جب ہم ان لطیف جذبات سے دوچار ہوئے تھے"

"میں اس نوجوان کے بارے میں بھی نہیں سوچ رہا تھا" میں نے کہا

"تو پھر؟" اس نے کہا"

"مجھے دراصل اس معمر آدمی آدمی سے دلچسپی ہے وہی جس نے اس لڑکی کو خطوط لکھے تھے" میں نے کہا ـــــ مجھے یقین ہے کہ ایسا رومانی خط لکھنے والا چاہے کتنا ہی معمر کیوں نہ ہو اُسے اس کی کچھ نہ کچھ قیمت ضرور ادا کرنی پڑی ہوگی۔ میں یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ اس کھیل کے کھیلنے والے کو کچھ دنوں بعد خود ہی یہ پتہ چل گیا ہوگا کہ وہ اپنے جال میں خود پھنس گیا ہے ۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ شروع شروع میں اُسے لڑکی کی خوبصورتی ۔ اس کے لطیف احساسات اور اس کے دل کی دھڑکن میں کوئی دلچسپی نہ ہو مگر جب وہی لڑکی اس کی زد سے باہر نکل گئی ہوگی تو اسے اس کھلونے کو اپنانے کی خواہش ضرور جاگ اُٹھی ہوگی ۔ میں تو اس بوڑھے کے بدلتے ہوئے جذبات اور اس کے جاگے ہوئے احساسات کی عکاسی کروں گا ۔ اس کے دل میں بھی محبت کی کسک ضرور پیدا ہوئی ہوگی اور اس کے ہاتھ سے محبت کا ہاتھ چھوٹ جانے کا غم اُسے ضرور ہوا ہوگا چاہے اس کی عمر کچھ بھی ہو۔ میں تو اپنی کہانی میں اُسے اس طرح پیش کروں گا کہ وہ خود لڑکی کے ارد گرد پھرتا رہے گا ۔ مگر اس میں اتنی ہمت نہ پیدا ہوگی کہ خود کو لڑکی کے سامنے ظاہر کرے ۔ وہ اس جگہ پھر لوٹ کر آئے گا جہاں اس نے یہ کھیل شروع کیا تھا اور اس امید پر ٹھہرے گا کہ شاید اس کا گمشدہ محبوب پھر اس جگہ واپس آجائے اور اس کی قسمت میں پھر ملاقات لکھی ہو۔

میرے ذہن میں کہانی کو اس طرح ختم کرنے کا نقشہ ہے جو بالکل ......"

"جھوٹ ہے سراسر جھوٹ"

میں چونک گیا۔ اس کی تیز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ اس سے پہلے کبھی اس نے اتنے شدید جذبات کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ مجھے یک بیک خیال آیا کہ شاید میں نے بے خیالی میں اس کی کوئی دکھتی رگ چھولی ہے۔ وہ یک بیک بالکل خاموش ہوگیا اور جب میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی تو اس کے کھڑے کھڑے بال دیکھ کر لرز گیا۔

میں نے اپنی بات کو دوسرا مطلب پہنانے کی کوشش کی مگر اس کے سامنے یہ کوشش بیکار گئی۔ اس وقت تک اس نے خود پر قابو پالیا تھا۔ اب اس نے بڑی دردناک مگر ہلکی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ کہانی کو اس طرح ختم کرنا واقعی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید وہ دوسری کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر بچ جائیں گے۔ مگر کیا تم نے مشہور شکاری کا واقعہ نہیں سنا جو خود اپنے جال میں پھنس گیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس بوڑھے کے دل میں اس واقعہ کی کسک اب تک باقی ہو"

وہ خاموشی سے اٹھا اور مجھے شب بخیر کہنے سے پہلے بولا: "گرمیوں کی سلونی شام کو نوجوانوں کو رومانی قصے سنانا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ ایسے وقت میں ان کے دل میں بے کار وہم اور جھوٹے خواب جاگ اٹھتے ہیں۔ اس کے بعد شب بخیر کہکر وہ واپس چلا گیا۔ —— وہ خاموشی سے اندھیرے میں چلتا رہا اور اس کی چال کا وہ معمرانہ انداز آج نہیں نظر آرہا تھا۔ کافی دیر ہو چکی تھی مگر مجھ میں پھر بھی تھکاوٹ کے کوئی آثار نہیں تھے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی انوکھی بات ہو جاتی ہے تو نیند اور تھکاوٹ دونوں غائب ہو جاتی ہے۔ میں بھی جھیل کے کنارے سیڑھیوں پر تنہا بیٹھ گیا۔ رات بڑی خوبصورت تھی، جگنو چاروں طرف اڑتے پھر رہے تھے۔ جھیل کی ہلکی لہریں سیڑھیوں سے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ کبھی کبھی ایک ستارہ اندھیری رات میں اِدھر اُدھر منڈلاتا جیسے اس کی نہ کوئی منزل ہو اور نہ کوئی راہ۔ بالکل انسانوں کی قسمت کی طرح جو نہیں جان سکتے کہ کب کیا ہو گا؟ ●●

قسط اوّل



اولمپک کھیلوں کی کہانی

آغا حامد رضوی

جدید دور کی متعدد تحقیقات کے باوجود اُولمپک کھیلوں کی ابتدا کی اصلیت ابھی تک صیغۂ راز میں ہے۔ بہر حال یہ بات ایک آفاقی حیثیت رکھتی ہے کہ پہلا اُولمپک کھیل ۷۷۶ سنہ عیسوی قبل مسیح میں ہوا تھا حالانکہ اس سے صدیوں قبل ہونے والے اُولمپک کھیلوں کے سُراغ بھی ملے ہیں اور اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ شاید اِن کھیلوں کی ابتدا تاریخ کے آغاز سے بہت پہلے ہو چکی تھی جس کا پتہ بعض ذی تخیئل یونانیوں سے چلتا ہے جو آج بھی اس بارے میں کئی عجیب و غریب و دلچسپ داستانیں سناتے ہیں جن کو وہ صرف روائتیں ہی نہیں سمجھتے بلکہ تہِ دل سے اصلیت جاننا اپنا ایک مقدس فریضہ سمجھتے ہیں۔

ان داستانوں میں سب سے زیادہ اہم داستان ہرکولس (HERCULES) کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہرکولس کو اپنے ماضی کے گناہوں کے کفّارے کے طور پر ایلس (ELIS) کے بادشاہ اُوجیس (AUGEAS) جس کے پاس جانوروں کا ایک بہت بڑا گلّہ تھا اصطبل صاف کرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ ہرکولس نے یہ کام آسانی سے کر دیا اور اس طرح وہ گلّہ کے دس فی صدی کمیشن کا بھی مستحق ہو گیا جو کہ اس عظیم کام کو بخوبی انجام دینے پر شرط کے مطابق اُسے ملنا تھا۔ ہرکولس نے یہ کام

دریائے اُوفیس (OPHEUS) کا رُخ اُوجیس کے اصطبل کی طرف موڑ کر گیا تھا۔ اُوجیس کو ہرکولس کا یہ طرزِ عمل ناگوار گذرا چنانچہ موقعہ آنے پر وہ اپنی طے شدہ شرط سے مکر گیا۔ اس بات پر ہرکولس حد درجہ برافروختہ ہوا اور اس نے اُوجیس کو قتل کر کے اس کے تاج پر قبضہ کر لیا۔ اپنی اس عظیم الشان کامیابی کا جشن منانے اور رسم تاج پوشی کے سلسلہ میں ہرکولس نے اُولمپک کھیلوں کی بنیاد ڈالی جس کا افتتاح ۱۲۵۳ قبل مسیح میں ہوا۔ ایک اور روایت کے مطابق جو کسی حد تک تاریخی اعتبار سے بھی ثابت ہوئی ہے لیکرگس (LYCURGUS) نے جو اسپارٹن قوم کا ایک بڑا قانون ساز تھا ۸۲۰ء قبل مسیح میں ایلس (ELIS) کے رہنے والے ایفیٹس (IPHITUS) کا ساتھ دیا اور اولمپک کھیلوں کے برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ لفظ برقرار اس سلسلے میں زیادہ اہم اس لئے ہے کہ اس سے کھیل کود کے پہلے بھی ہوتے رہنے کا پتہ چلتا ہے۔

پیلپس (PELOPS) کی داستان :۔

یونانی روائتیں ایک اور عجیب و غریب داستان کی غمازی کرتی ہیں جس کے مطابق یونان کے سب سے معزز دیوتا زوئس (ZEUS) نے اس کھیل کا آغاز اپنے باپ کروناس (KRONOS) کے جشن فتحیابی کے سلسلے میں کیا تھا۔ اس کھیل میں دنیا پر قبضہ پانے کے لئے بڑے بڑے دیوتاؤں میں زبردست کشتی کا مقابلہ ہوا تھا۔

مگر اس سلسلے کا سب سے اہم قصہ پیلپس (PELOPS) کا ہے جو رومان اور تحیّر سے بھرپور ہے۔ یہ قصہ ایلس کے بادشاہ اُوناس (OENOMAUS) اور اس کی لڑکی ہیپوڈیمیا (HIPPODAMIA) سے تعلق رکھتا ہے اور اس قصّے میں بھی دریائے الفیس کا تذکرہ بڑا اہم ہے۔ اس زمانے میں ہر خاص و عام کے لئے منادی کر دی گئی تھی کہ جو بھی اوناس کی بیٹی کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اس کی شادی اسی کے ساتھ کر دی جائے گی۔ یہ بات بڑی پُرخطر تھی۔ ہیپوڈیمیا کا باپ نیزے بازی میں بڑا مشاق تھا۔ وہ اپنے تیز رفتار رتھ میں بیٹھ کر اغوا کرنے والوں کو راستے میں ہی دبوچ لیتا۔ اس طرح تیرہ نوجوانوں نے باری باری ہیپوڈیمیا کو اغوا کرنے کی کوشش کی مگر وہ راستے ہی میں پکڑے گئے اور وہیں شاہی نیزے

ان کے سینے میں پیوست کر دیئے گئے۔ آخر میں پیلپس (PELOPS) نامی ایک پھرتیلا
نوجوان آیا جس نے پہلے ہی حالات کی اصلیت کا اندازہ بخوبی لگا لیا اور اسی کے مطابق
اپنا پروگرام مرتب کیا۔ اس کے بعد وہ ہپوڈیمیا کو لے کر شاہی محل سے نکل پڑا۔ شاہی
رتھ نے اس کا پُر زور تعاقب کیا مگر پیلپس نے رتھ بان کو شاہی رتھ میں خرابی پیدا
کر دینے کی رشوت پہلے ہی دے دی تھی۔ اس لئے اس کا بہت دیر تک پیچھا نہ کیا
جاسکا اور پیلپس آخر کار ہپوڈیمیا سے شادی کرنے کا مستحق ہو گیا اور ساتھ ہی
شاہی تخت کا وارث بھی بن گیا۔ اس خوشی کے افتتاح میں نوجوان پیلپس نے ۸۸۴ء
قبل مسیح میں اولمپیا میں ایلس (ELIS) کے کھلے میدان میں طرح طرح کے کھیل
اور مذہبی رسومات کی بنیاد ڈالی۔

ان تمام باتوں کی حقیقت کچھ بھی ہو مگر پھر بھی یہ امر مسلّمہ ہے کہ اولمپک
کھیلوں کا پہلا عملی ثبوت ۷۷۶ء قبل مسیح سے ملتا ہے جس کے بعد یونانیوں نے
اس کا باقاعدہ حساب رکھنا شروع کیا اور یہ کھیل ہر چار سال کے وقفے پر ہونے لگے۔
پرانی داستانوں کو بالائے طاق رکھنے پر بھی ہمارے سامنے ۳۱۲ ریکارڈ کئے ہوئے
اولمپک کھیلوں کا ثبوت موجود ہے۔ اگلے سال میکسیکو میں ہونے والا دورِ جدید کا
انیسواں اولمپک کھیلوں کا مقابلہ دراصل اس سلسلے کی تاریخ کا ۳۱۳ واں کھیلوں
کا مقابلہ ہوگا۔

اولمپیا کا خاکہ :-

اس سلسلے میں اولمپیا کا ایک ذہنی خاکہ مرتب کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان
باتوں کا اندازہ اب جدید (EXCAVATION)، شاعروں کے کلام اور دیگر
لکھنے والوں کے تذکروں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ جنوب اور مغرب کی طرف دو ندیاں
الفیس اور کلیڈس اولمپیا کو گھیرے ہوئے تھیں۔ اس کے شمالی جانب پہاڑیوں
کے سلسلے تھے۔ پورب کی جانب ایک بہت بڑا کھلا ہوا میدان تھا، ایک سنگ مرمر کا
کا اسٹیڈیم شمالی پہاڑیوں کے ڈھال پر تھا۔ یہ میدان ۲۱۴ گز لمبا اور ۳۲ گز چوڑا
تھا۔ اس میں ساٹھ ہزار تماش بینوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ گھوڑ دوڑ کے میدان

میں کئی سنگ مرمر کے چبوترے بنے تھے جو رتھ کی دوڑ کے کام آتے۔ اس میدان کی لمبائی ۸۰۶ گز اور چوڑائی ۴۰۵ گز تھی۔

اولمپیا کسی زمانے میں مذہبی عمارتوں اور مندروں سے گھرا ہوا تھا۔ (OLYMPIUM) اُولمپیئیم کی عظیم عمارت جس میں زوئس کا ایک بڑا مجسمہ خالص سونے میں ملبوس توجہ کا خاص مرکز تھا۔

کھیلوں کی ترقی:۔

اولمپک کھیلوں میں مختلف کھیلوں کا رواج رفتہ رفتہ ہوا۔ سب سے پہلے صرف دو سو گز کی دوڑ کا رواج تھا۔ کیروبس (CAROE BOS) ایلس کا ایک باشندہ اولمپک کھیلوں میں کامیابی حاصل کرنے والا پہلا شخص تھا جو ۷۷۶ قبل مسیح کی اُس دو سو گز کی دوڑ میں اوّل آیا تھا اور بطور انعام اس کو انجیر کی پتیوں کا تاج پہنایا گیا تھا۔

اُولمپک کے چودھویں کھیل میں جو پہلے کھیل کے باون برس بعد ہوا تھا ایک دوسری طرح کی دوڑ کا سلسلہ شروع ہوا۔ پندرھویں مقابلے میں اسٹیڈیم کے بارہ چکر پورا کرنے کی لمبی دوڑ کا آغاز ہوا۔ اٹھارھویں مقابلے میں تو پانچ اور نئے طرح کے کھیل شامل ہو گئے۔ اس میں جست لگانے، نیزہ بازی، ۲۰۰ گز کی دوڑ اور کشتی کے مقابلے شامل تھے۔ مُکّہ بازی کا آغاز ۲۳ ویں مقابلے سے شروع ہوا۔

آج بھی اُولمپیا میں ہونے والے مقابلے کی نوعیت کم و بیش وہی ہے جو شروع میں تھی۔ سوائے اِس فرق کے کہ اُس زمانے میں دوڑنے والے اپنے ساتھ وزنی بوجھ لے کر دوڑ کے مقابلے میں شریک ہوتے تھے۔ بعض کھیلوں کی ابتدا مذہبی عقائد کی تکمیل کے بعد شروع ہوتی تھی۔ کوئی نامناسب شخص اس مقابلے میں شریک ہونے کا حقدار نہ تھا۔ پرانے اولمپک کھیل زوئس کے عظیم مجسمے کے سامنے کھلاڑیوں اور ججوں کے حلف لینے کے بعد شروع ہوتے۔ کھلاڑی مذہبی طریقے سے پیش آنے، کھیل میں جوش و خروش قائم رکھنے کی اور جج انصاف پسندی کی قسم کھاتے تھے۔ ہر شخص کھیل کی کامیابی کی دعائیں کرتا تھا۔ کھیل کے اختتام پر شکرانہ کی عبادت کا بھی رواج تھا۔

یہ تھی ایک طویل داستان کی مختصر کہانی۔ اُولمپک کھیلوں کی تاریخ جو صدیوں سے پُر زور اور خوش گوار ولولوں کا پیش خیمہ بنتی آئی ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

اودھ کی حویلیوں کی

مکتبہ فسانہ کی پیشکش

رنگین و پُرجلال

داستان



قاضی عبدالستار

کے قلم سے

ایک عظیم ناول

ضخامت تقریباً ۱۳۰ صفحات

قیمت ۳ روپے ۷۵ پیسے

مکتبہ فسانہ عُثمانی منزل دائرہ شاہ اجمل الہ آباد



میں نے جس زمانے میں امبل میرد کے چیتے کو ہلاک کیا، انہی دنوں ریاست میسور کے جنگلوں میں ایک آدم خور شیر نے اودھم مچا رکھا تھا۔ بنگلور میں میرا ایک عزیز دوست میکنٹوش رہتا تھا۔ میں حسب معمول اُس کے پاس جا کر ٹھہرا۔ میکنٹوش کی بیوی بڑی بہادر اور نڈر عورت تھی اور مجھے معلوم تھا کہ اس انگریز خاتون نے دو شیر مارے ہیں۔ یہاں آنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ میں اس خاتون کے کارنامے سننا چاہتا تھا۔

اگلے روز ہم تینوں میکنٹوش کی کار میں بنگلور سے چیتل دروگ کی طرف روانہ ہوئے جو ضلع بھی ہے اور ضلع کا صدر مقام بھی۔

ہمارے آنے سے دو روز پہلے آدم خور نے چیتل دروگ میں دو افراد کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ یہاں سے ہم ہولکر کی طرف چلے، تو چند آدمیوں نے بتایا کہ آدم خور یوگی مت کے پرانے قصبے میں پھرتا ہوا دیکھا گیا ہے۔ ہوس درگا جانے والی سڑک کے پانچویں میل پر ایک لمبی چوڑی جھیل واقع ہے جس میں بڑی بڑی مچھلیوں کے علاوہ مگرمچھ بھی پائے جاتے ہیں۔ اس ندی کے دونوں کناروں پر اس قدر گھنا جنگل ہے کہ دن کے وقت بھی راستہ سُجھائی نہیں دیتا۔ جنوب کی طرف یوگی مت پہاڑی ہے جس کے اوپر صدیوں پرانے قلعے کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔ میں اس سے پہلے بھی یہ قلعہ دیکھ چکا تھا۔ اور مجھے معلوم تھا کہ یہ جنگل درندوں، خصوصاً ریچھوں اور چیتوں کی بہترین پناہ گاہ ہے اور کبھی کبھی

شیر بھی ادھر آنکلتا ہے۔

ہم اسی روز شام سات بجے کے لگ بھگ موٹر میں سوار ہو کر ہلکی رفتار سے ہوس ڈرگا روانہ ہو گئے۔ جنگل میں خلافِ معمول سناٹا طاری تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آدم خور کی ہیبت انسانوں ہی پر نہیں، حیوانوں پر بھی طاری ہے۔ ایک میل کے فاصلے پر کھجوروں کے اونچے اونچے درخت نظر آنے لگے اور چند منٹ بعد ہم وسیع جھنڈ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ کار کی بڑی بتیوں کی روشنی میں دور کا منظر صاف نظر آرہا تھا، اس کے باوجود ہم نے طاقتور برقی ٹارچوں سے چاروں طرف کا اچھی طرح جائزہ لیا، وہاں کوئی ذی روح نہ تھا۔

"خدا کی پناہ! کتنی خوفناک جگہ ہے۔" میکنٹوش نے کہا۔ "ذرا اس جھنڈ کو دیکھو، میرا خیال ہے اس میں کئی سو آدم خور بیک وقت چھپ سکتے ہیں۔ چلو گاڑی آگے بڑھاؤ۔"

گاڑی چیونٹی کی رفتار سے رینگنے لگی۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے کھجوروں کا جھنڈ گنجان ترین ہوتا جاتا تھا۔ ہم ٹارچوں کی روشنیاں مسلسل اردگرد پھینک رہے تھے۔ دفعتہً مسز میکنٹوش نے بریک لگا کر گاڑی روک لی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"دیکھیے اس درخت پر کون ہے؟"

ہم نے اس کی انگلی کے اشارے کا تعاقب کیا، تو حیرت سے ہماری آنکھیں پھیل گئیں۔ ہماری دائیں جانب کوئی پچاس ساٹھ فٹ کے فاصلے پر کھجور کا ایک درخت تھا جس پر کوئی سیاہ فام جسیم آدمی تیزی سے چڑھ رہا تھا، پھر وہ کھجور کے پکے ہوئے خوشے توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ کبھی کبھی گردن گھما کر کار کی طرف دیکھتا اور کھجوریں کھانے لگتا۔ چند لمحے بعد وہ نیچے اترنے لگا، میرے کہنے پر مسز میکنٹوش نے کار آگے بڑھائی اور درخت کے نزدیک لے کر روک دی۔ اب ہم نے دیکھا کہ جس کو ہم سیاہ فام آدمی سمجھ رہے ہیں، وہ ایک تنومند ریچھ ہے۔ ہمیں قریب پا کر وہ دوبارہ درخت پر چڑھنے لگا۔ اتنے میں مسز میکنٹوش نے کار کا دروازہ کھولا اور 3006 سپرنگ فیلڈ رائفل سے نشانہ لیکر فائر کر دیا۔ ریچھ آٹے کی بوری کی مانند دھم سے نیچے گرا اور گرتے ہی ٹھنڈا ہو گیا۔

"کیا کہنے ہیں!" بیوی کے نشانے کی شوہر نے داد دی "لیکن میکی یہ تو بتاؤ کہ بیچارے ریچھ کو مارنے سے کیا فائدہ ہوا؟"

"میں اپنی اس نئی رائفل کو آزمانا چاہتی تھی۔" مسز میکنٹوش نے ہنس کر جواب دیا۔ "اب اس کی چار من وزنی لاش بھی تم ہی اٹھا کر لاؤ۔"

"تم فکر نہ کرو، مسٹر اینڈرسن اکیلے ہی اُسے اُٹھا لائیں گے، لیکن ابھی اسے یہیں پڑا رہنے دو، ہوس دُرگا کا چکر کاٹ کر آئیں گے، تو اُسے لاد لیں گے!"

اگلے روز صبح ناشتے کے بعد ہم نے ریچھ کی کھال اُتاری اور پھر ہوس دُرگا نہ روانہ ہو گئے۔ ہم وہاں کے لوگوں سے آدم خور کی حالیہ سرگرمیوں کے بارے میں "انٹرویو" لینا چاہتے تھے۔ راستے میں کھجوروں کے جھنڈ کا تفصیلی معاینہ کیا، تو کئی جگہ شیر کے پنجوں کے مدھم نشان نظر آئے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اس گنجان ترین علاقے میں شیر کو تلاش کرنا ناممکن ہے۔

ہوس دُرگا والوں نے اُن دو وارداتوں کا ذکر کیا جو کئی ہفتے قبل بستی کے نواح میں وقوع پذیر ہوئی تھیں۔

رات کے آٹھ بجے تھے۔ گیارہ سال کی ایک لڑکی اپنے مکان سے باہر نکلی اور رفع حاجت کے لیے گھر سے کچھ فاصلے پر جنگل میں گئی۔ اُسے زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹے بعد گھر واپس پہنچ جانا تھا، لیکن ایک گھنٹہ گزر گیا۔ لڑکی کے ماں باپ سخت پریشان تھے کہ وہ اب تک کیوں نہیں آئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا اضطراب اور خوف بڑھتا گیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اگر کوئی درندہ لڑکی پر حملہ آور ہوتا تو اس کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ آخر لڑکی کا باپ اور بھائی لالٹین لے کر گھر سے نکلے اور ایک دو فرلانگ تک اچھی طرح دیکھنے بھالنے کے بعد ناکام واپس چلے آئے۔ اتنے میں گاؤں والوں کو لڑکی کے گم ہو جانے کا علم ہو گیا۔ فوراً ہی پچاس ساٹھ آدمی ہاتھوں میں لالٹینیں، لٹھ، کلہاڑیاں اور دو مزل لوڈنگ بندوقیں لے کر جنگل میں پہنچے اور بستی سے کوئی آدھ میل دور لڑکی کے پھٹے پرانے کپڑے جھاڑیوں میں پڑے پائے۔ خون کا کوئی دھبہ دکھائی نہ دیا۔ اگلے روز صبح سویرے بھی لڑکی کو دیر تک تلاش کیا گیا، مگر کوئی سراغ نہ ملا۔

ہوس دُرگا سے مشرق کی جانب پانچ میل دور ایک چھوٹا سا تالاب ہے جس پر گاؤں کے دو دھوبیوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ یہ سگے بھائی تھے۔ دن بھر تالاب پر کپڑے دھوتے اور سورج چھپنے سے پہلے پہلے اپنے تین گدھوں پر دُھلے ہوئے کپڑے لاد کر گاؤں کی طرف روانہ ہو جاتے۔ ایک روز شام کو حسبِ معمول وہ گدھوں پر کپڑے لاد کر واپس آ رہے تھے۔ بڑا بھائی گدھوں کے آگے آگے چل رہا تھا اور چھوٹا بھائی اُنھیں پیچھے سے ہانک رہا تھا۔ ابھی وہ گاؤں سے ایک میل دور تھے کہ یکایک ایک شیر جھاڑیوں سے نکلا اور اس سے پہلے کہ بڑا بھائی آواز نکالے یا بھاگنے کی کوشش کرے، شیر نے اُسے منہ میں دبایا اور آناً فاناً غائب ہو گیا۔ چھوٹے بھائی نے یہ ماجرا دیکھا، تو اُلٹے پاؤں

بھاگ نکلا اور تالاب پر پہنچ کر دم لیا۔

رات کے آٹھ بج گئے اور دھوبی گھر نہ پہنچے، تو اُن کی بیویاں اونچی آواز سے رونے لگیں۔ گاؤں والے جمع ہوئے اور رات کے دس بجے کیل کانٹے سے لیس ہو کر دھوبیوں کی تلاش میں نکلے۔ تالاب کو جانے والے راستے پر انھوں نے ایک گدھے کو اطمینان سے اونگھتے پایا۔ کپڑوں کی گٹھڑی اس وقت بھی گدھے کی پیٹھ سے بندھی ہوئی تھی۔ تالاب سے دو فرلانگ کے فاصلے پر دوسرا دھوبی بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے دانت بھنچے ہوئے اور آنکھوں کی پتلیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ ایک گھنٹے بعد اُسے ہوش آیا اور وہ یہ دردناک قصہ سُنانے کے قابل ہو سکا۔ پھر وہ گاؤں والوں کو لے کر اس مقام تک آیا جہاں شیر نے اُس کے بڑے بھائی کو مُنہ میں دبایا تھا۔ گاؤں والے اگرچہ کلہاڑیوں، چاقوؤں، نیزوں اور بندوقوں سے مسلح تھے، لیکن آدم خور کی ہیبت ان کے دلوں پر اس قدر بیٹھی ہوئی تھی کہ بار بار خوف زدہ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتے اور کوئی شخص جھاڑیوں کے نزدیک جانے کی جرأت نہ کرتا تھا۔

اگلے روز دن کی روشنی میں پھر یہ لوگ جنگل میں گئے اور ایک گھنٹے بعد دھوبی کی ادھ کھائی لاش اور اُس کے خون آلود کپڑے تلاش کر لینے میں کامیاب ہو گئے۔ شیر نے رات بھر میں لاش کا تین چوتھائی حصہ ہڑپ کر لیا تھا۔ بدنصیب دھوبی کا سر، دونوں بازو، ایک ٹانگ اور دوسرے پیر کی انگلیاں شیر نے شاید کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دی تھیں۔ لاش کے یہ اجزا جمع کر کے گاؤں لائے گئے اور کریا کرم کیا گیا۔ اس دوران میں باقی دو گدھے بھی گھاس چرتے ہوئے مل گئے، انھیں خراش تک نہ آئی تھی۔

تیسری واردات ہمارے آنے سے صرف چار روز پیشتر ہوئی۔ دن کے تین بجے ایک بیل گاڑی ہوس دُرگا سے ہولکر کی طرف جا رہی تھی۔ بیل اپنی راہ پہچانتے تھے، وہ مزے مزے میں چلے جا رہے تھے اور گاڑی بان اُونگھ رہا تھا۔ گاڑی ابھی چوتھے میل پر تھی کہ شیر کے غرّانے کی آواز سُن کر بیل بھڑک گئے۔ گاڑی بان کی زندگی کے چند دن ابھی باقی تھے۔ اس نے بروقت شیر کو جھاڑیوں سے نکل کر گاڑی کی طرف لپکتے دیکھ لیا اور گاڑی سے کود کر ایک طرف چڑھ گیا۔ شیر جھلّا کر درخت کے گرد گھومتا اور بار بار منہ اُٹھا کر غرّاتا رہا۔ کئی مرتبہ اس نے جست کی، لیکن گاڑی بان اس کی پہنچ سے باہر درخت کی اونچی شاخوں میں دبکا بیٹھا رہا۔ شیر نے مایوس ہو کر بیلوں پر حملہ کیا اور آناً فاناً ایک بیل کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا، لیکن گوشت کھائے بغیر غرّاتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ دوسرے بیل

اُس نے کچھ نہ کہا۔

دو گھنٹے بعد جب گاڑی بان نے محسوس کیا کہ شیر دُور چلا گیا ہوگا تو وہ چپکے سے اُترا اور دوسرا بیل، گاڑی میں جوت کر روانہ ہوگیا اور لوگوں کو سارا قصّہ سُنایا۔

ان خبروں کے بعد لوگوں نے ہمیں بتایا کہ اس روز دو انگریز شکاری یہاں آئے اور سرکاری بنگلے میں ٹھہرے۔ ان کے پاس بھی موٹر ہے اور وہ شیر کو مارنے کے ارادے سے آئے ہیں، لیکن ابھی تک کامیاب نہیں ہوئے۔

شام کو وہ دونوں شکاری ہم سے ملنے آئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ تجربہ کار آدمی ہوں گے، لیکن وہ نوجوان تھے اور انھوں نے جس انداز میں رائفلیں پکڑ رکھی تھیں۔ اس سے فوراً اندازہ ہو گیا کہ اناڑی ہیں، ایک کا نام انسی اور دوسرے کو ٹاڈ کہتے تھے۔ انھوں نے اس سے پہلے آدم خور کا شکار کبھی نہیں کیا تھا اور اس خطرناک مہم پر وہ پہلی بار نکلے تھے۔ میں نے یہ سوچ کر کہ نقصان نہ اُٹھائیں، اُنھیں بتایا کہ آدم خور کو تلاش کرنا اور پھر اُسے مارنا اتنا آسان نہیں جتنا وہ سمجھ رہے ہیں۔ اس کے لیے بڑی دُور اندیشی، استقلال اور جراُت کی ضرورت ہے۔ میری باتیں سُن کر انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔ غالباً وہ مجھے احمق سمجھ رہے تھے۔ پھر انسی نے کہا:-

"جناب، ہم پہلے بھی کئی چیتے اور شیر مار چکے ہیں۔ آپ کو یقین نہیں آتا۔ میں آپ کو اپنی البم دکھاتا ہوں"۔

"البم بعد میں دیکھ لی جائے گی، یہ بتائیے کہ آپ کا واسطہ کبھی آدم خور سے پڑا ہے؟"

"جی نہیں .... مگر"

"ہم آپ کے شکر گزار ہیں"۔ ٹاڈ نے کہا۔ "اور آپ کی شہرت سے بھی آگاہ ہیں۔ اگرچہ آدم خور سے مقابلے کا یہ پہلا موقع ہے، لیکن ہمیں یقین ہے کہ ہم اسے ہلاک کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ آپ صرف ہماری رہنمائی کرتے رہیے"۔

"میں ہر طرح حاضر ہوں، اچھا یہ تو بتائیے کہ اس سلسلے میں آپ کہاں تک پہنچے ہیں؟"

"جس مقام پر شیر نے دھوبی کو کھایا تھا، وہاں ہم نے گذشتہ رات ایک بھینس باندھ دی تھی اور اب ہم اپنے قلیوں کو اس کی خبر لینے بھیجا ہے۔ اگر آدم خور ابھی تک اس علاقے میں موجود ہے، تو یقیناً اس نے بھینس کا تیا پانچا کر دیا ہوگا"۔

ساڑھے تین بج رہے تھے کہ ہم پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے۔ یہاں جھاڑ جھنکاڑ کثرت سے تھا اور شاید آدم خور انہی میں کہیں چھپا ہوا تھا۔ ہم نہایت احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے۔ آخر ایک جگہ ہم نے بیچارے ٹاڈ کو اس حالت میں پایا کہ آدم خور اس کے جسم کا حصہ ہڑپ کر چکا تھا۔ ٹاڈ کی لاش کا یہ حال دیکھ کر کون تھا جو متاثر نہ ہوتا، مگر انسی کی حالت یکدم بگڑ گئی۔ پہلے اس کے منہ سے چیخ نکلی پھر وہ دھڑام سے زمین پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

ہمیں ڈر تھا کہ انسی اس غم سے پاگل نہ ہو جائے۔ وہ جب بھی ہوش میں آتا اپنے دالے دوست کو پکارتا اور دیر تک اس سے باتیں کرتا۔ میں نے اُسے موٹر میں بٹھایا اور سیدھا چینل ڈگ ڈروڈ ہسپتال میں لے جا کر داخل کرا دیا۔ پولیس کو اس حادثے کی اطلاع دی اور تمام دن ان کے ساتھ مارا مارا پھرا اور شام کو جب میں ہوس ورگا واپس پہنچا، تو تھکن، صدمے اور بھوک کے مارے جان لبوں پر آ چکی تھی۔ میکنوش اور اس کی بیوی بھی نوجوان ٹاڈ کی اس حسرت ناک موت کے باعث ازحد افسردہ خاطر تھے اور خود مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا کوئی عزیز ترین ساتھی بچھڑ گیا ہے، حالانکہ ٹاڈ سے میری ملاقات بہت مختصر ہوئی تھی۔

"انتقام کی آگ میرے سینے میں سُلگ رہی ہے"۔ میکنوش نے کہا۔ "ہمیں اس آدم خور سے دو دو ہاتھ کرنے ہی ہوں گے"۔

"بیشک!"۔ میں نے تائید کی۔

اس رات ہم میں سے نیند کسی کو نہ آئی۔ آدم خور سے مقابلہ کی نت نئی تدبیریں سوچتے اور اس پر بحث کرتے رہے۔ صبح ناشتے کے بعد نئے عزم اور نئے حوصلے سے جنگل کی طرف چلے اور پھر اس مقام پر پہنچے جہاں سے یہ حادثہ پیش آیا تھا۔ ہم نے آدم خور کے پیروں کے نشان تلاش کرنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہے۔ بارش نہ ہونے کے باعث زمین خشک ہو کر انتہائی خشک ہو چکی تھی۔ اگر پنجے کا ہلکا نشان بھی کہیں مل جاتا تو مجھے یہ معلوم کرنے میں دقت نہ ہوتی کہ آدم خور نر ہے یا مادہ اور اس کا قد و قامت اور وزن کتنا ہوگا۔ انسی نے آدم خور کا جو مشکوک حلیہ بیان کیا تھا اس سے یہی اخذ کیا جا سکتا تھا کہ وہ شیر ہے۔ جس مقام پر ٹاڈ کی لاش کے بچے کھچے اجزا ملے تھے، وہاں ہم نے دیر تک تفتیش کی کہ شاید آدم خور کے پنجوں کا مدھم سا نشان ہی مل جائے، مگر بے سود۔ ٹاڈ اور انسی نے جس جگہ بھینس باندھی تھی اور اُسے شیر نے ہلاک کر دیا تھا، ہم وہاں بھی گئے۔ بھینس کے سڑے ہوئے گوشت پر بہت سے گدھ دعوت اُڑا رہے تھے۔ ہمیں قریب آتے دیکھ کر

وہ اُڑے اور اِدھر اُدھر پتّوں پر بیٹھ گئے۔

"شیراب ادھر نہیں آئے گا۔" میکنٹوش نے کہا۔ "گدھوں نے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔"

"فکر نہ کرو، میں دوسری بھینس کا انتظام کرتا ہوں، ہمیں اب نئے سرے سے اس مہم کا آغاز کرنا پڑے گا۔ ہم اس بھینس کو وہیں باندھیں گے جہاں شیر نے دھوبی کو ہلاک کیا تھا!"

"اس کا فائدہ؟" مسز میکنٹوش نے پوچھا۔

"میرا پروگرام یہ ہے کہ مسٹر میکنٹوش اس مقام پر گھات میں بیٹھیں گے جہاں بھینس باندھی جائے گی اور میں اسی پتھر کے اوپر لیٹوں گا جہاں سے آدم خور ٹاڈ کو اٹھا کر لے گیا تھا ہمیں بہر حال یہ خطرہ مول لینا ہی ہوگا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارا مقابلہ دو شیروں سے ہے ان میں سے ایک بھینس پر حملہ کرے گا اور دوسرا آدمی کی تلاش میں آئے گا، لیکن آدمی نہ ملنے کے باعث وہ مجبوراً بھینس کے گوشت پر آئے گا جسے اس کا ساتھی شیر یا شیرنی پہلے ہی ہلاک کر چکی ہوں گی۔ وہ ادھر آئے تو تم اسے رائفل کا نشانہ بنا دینا، اور میری طرف آئے گا، تو میں اس سے نمٹ لوں گا۔ میں پتھر پر اس لیے لیٹنا چاہتا ہوں کہ آدم خور پہاڑی کی طرف سے آئے تو میں اس کی آہٹ سن سکوں۔"

"گویا آپ خود اسی حماقت کو دہرانا چاہتے ہیں جو ٹاڈ نے کی تھی۔" مسز میکنٹوش نے حیرت سے کہا۔

"محترمہ، ممکن ہے یہ حماقت ہی ہو، لیکن براہِ کرم مجھ میں اور ٹاڈ میں فرق ملحوظ رکھیے۔ وہ نوجوان ناتجربہ کاری اور ضد کے باعث اپنے دردناک انجام کو پہنچا، لیکن میری تو عمر ہی ان دھندوں میں کٹی ہے۔ اگر آدم خور مجھے وہاں سے لے بھی جائے تو کسی کو قطعاً کوئی رنج نہ کرنا چاہیے۔"

میکنٹوش کو جہاں بیٹھنا تھا وہاں کوئی درخت ایسا نہ تھا جس پر مچان باندھی جا سکے اس مشکل کو حل کرنے کی تدبیر صرف یہ تھی کہ زمین میں گڑھا کھودا جائے اور میکنٹوش کے بیٹھنے کے بعد گڑھے کا منہ خشک شاخوں اور جھاڑیوں سے بند کیا جائے اور چاروں طرف چھوٹے بڑے پتھر رکھ دیے جائیں۔ گاؤں سے چھ آدمیوں کو بلوا کر گڑھا کھدوایا گیا اور جب یہ مکمل ہو گیا اور میکنٹوش اس میں بیٹھنے کی تیاریاں کرنے لگا، تو اس کی بیوی ضد کرنے لگی کہ وہ اپنے شوہر کو ہرگز تنہا نہ چھوڑے گی اور اسے بھی گڑھے میں بیٹھنے دیا جائے۔ ہمیں اس کی ضد کے آگے سر جھکانا ہی پڑا۔ جب وہ دونوں اس میں اُتر گئے تو منصوبے کے مطابق گڑھے کا منہ بند کر دیا گیا۔ کہیں کہیں ہوا آنے اور نشانہ لینے کے لیے جگہ پہلے سے چھوڑ دی گئی تھی۔ اس تنگ

بُرا حال تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُس نے ہانپتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن مُنہ سے الفاظ ہی نہ نکلے۔ اتفاق سے میری جیب میں برانڈی کی آدھی بوتل موجود تھی۔ دو گھونٹ پینے کے بعد وہ کچھ سنبھلا اور اُس کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے:-

"شیر...... لے گیا اُسے......"

اور اس کے ساتھ ہی وہ معصوم بچّے کی طرح میرے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگا۔ میں اُسے سنبھالتا اور دلاسے دیتا ہوا بنگلے میں لے گیا۔ میکنٹوش اور اس کی بیوی کو بیدار کیا۔ السی کو بستر پر لٹا کر اُسے کمبل اوڑھائے گئے کیونکہ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ مسز میکنٹوش اُس کے تلوے سہلانے لگیں اور میکنٹوش نے جلدی سے برانڈی کی نئی بوتل کھول کر گلاس پُر کیا اور السی کے مُنہ سے لگا دیا۔ اب ہم نہایت بے صبری سے اس کہانی کے منتظر تھے جو السی ہمیں سُنانے والا تھا۔ پندرہ منٹ بعد اُسکی حالت کچھ ٹھیک ہوئی، لیکن اُسے دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا جیسے برسوں کا بیمار ہے۔ چہرے کا رنگ اب بھی ہلدی کی طرح زرد تھا اور آنکھوں میں آنسو، پھر بھرائی ہوئی آواز میں وُہ کہنے لگا:-

"کاش ہم آپ کی بات مان لیتے اور میرے عزیز دوست کی جان بچ جاتی!"

ہم تینوں دم بخود بیٹھے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چند لمحے سسکیاں بھرنے کے بعد اُس نے بیان دوبارہ شروع کیا:-

"آپ کو یاد ہوگا مسٹر اینڈرسن، میں اُس پتھر کے پیچھے بیٹھا تھا جو جنگل کی طرف سے آنے والی پگڈنڈی کے کنارے پڑا تھا اور ٹاڈ نے اپنے لیے وہ پتھر منتخب کیا تھا جو پہاڑی کے سامنے تھا تاکہ آدم خور اُدھر سے آئے تو وہ اسے دیکھ سکے۔ پوزیشن ایسی تھی کہ میں تو ٹاڈ کو دیکھ رہا تھا، لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

آپ لوگوں کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی میں نے یوں محسوس کیا جیسے اس طرف جھاڑیوں میں کوئی جانور آہستہ آہستہ حرکت کر رہا ہے۔ میں نے اس کی ہلکی سی جھلک بھی دیکھی، لیکن وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا، البتّہ سیٹی بجا کر ٹاڈ کو خبردار رہنے کا اشارہ ضرور کر دیا تھا۔ رات کے دس بج گئے، مجھے یاد ہے کہ اس وقت میں اونگھ رہا تھا کہ دفعتہً ایسی آواز کانوں میں آئی جیسے کوئی درندہ ہڈیاں چبا رہا ہو، بے شک آواز وہی تھی۔ شیر بھینس کی بقیہ لاش ہڑپ کر رہا تھا۔ یہ آواز یقیناً ٹاڈ نے سُن لی ہوگی کیونکہ وہ بھینس کی لاش کے زیادہ قریب بیٹھا تھا۔ لیکن جب اس نے کوئی فائر نہ کیا تو مجھے اُلجھن ہونے لگی۔ ایسا نہ ہو کہ درندہ پیٹ بھرنے کے بعد نکل جائے۔ مجھے ٹاڈ پر غصّہ آنے لگا۔

وہ فائر کیوں نہیں کرتا، کہیں سو تو نہیں گیا۔ ہر لمحے میرا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔۔۔۔!"

"پھر تم نے کیا کیا؟" مسز میکنٹوش نے پوچھا۔

"میں پھر یہی سمجھا کہ ٹاڈ سو گیا ہے، اس لیے اب مجھے ہی شیر پر گولی چلانی چاہیے! چنانچہ میں نے اپنی ٹارچ روشن کی اور دیکھا کہ ایک بہت بڑا شیر بھینس کی لاش پر کھڑا اطمینان سے جبڑا چلا رہا ہے۔ روشنی ہوتے ہی میں نے ٹاڈ کے چیخنے کی آواز سنی۔ شیر کو دیکھ کر دہشت سے اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ شیر پوری قوت سے گرجا۔ اس نے مڑ کر اس پتھر کی طرف دیکھا جس کے پیچھے ٹاڈ چھپا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں فائر کرتا، شیر ایک ہی جست میں وہاں پہنچ گیا۔ اتنا یاد ہے کہ میں نے اپنے دوست کی ایک اور چیخ سنی تھی اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔"

تھوڑی دیر رونے کے بعد النسی نے پھر کہا:۔

"میں نے ٹاڈ کو آوازیں دیں، کوئی جواب نہ ملا۔ میں اسے پکارتا ہوا اس پتھر تک گیا لیکن ٹاڈ نظر نہ آیا۔ اس کی رائفل، پانی کی بوتل اور سینڈوچز کا آدھا پیکٹ وہیں پڑا تھا۔ یہ خیال کہ آدم خور ٹاڈ کو لے گیا، مجھے بدحواس کر دینے کے لیے کافی تھا۔ کوئی غیبی قوت تھی جو مجھے ہوس ڈرگا جانے والی سڑک پر کھینچ لے گئی ورنہ اس کے گھنے جنگل میں بھٹک کر میں بھی آدم خور کا شکار ہو جاتا۔"

النسی کی کہانی اور پچھلے تمام واقعات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں نے اندازہ کیا کہ ہمارا واسطہ دراصل دو شیروں سے ہے۔ ان میں سے ایک آدم خور اور دوسرا مویشیوں کا دشمن ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ شیر اور شیرنی ہوں۔ میں نے شیر کا حلیہ پوچھنے کی کوشش کی تو النسی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ بار بار یہی کہتا تھا کہ وہ شیر ہی تھا، شیرنی ہرگز نہیں تھی۔ بہرحال پندرہ منٹ کے اندر ہم نے اپنے گاؤں میں سے بیس آدمی جمع کیے اور جنگل کی طرف چلے۔ ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی ہتھیار تھا۔ مسز میکنٹوش اور النسی بھی ساتھ جانے پر بضد تھے۔ انہیں بھی ساتھ لیا اور تھوڑی دیر بعد ہم اس منحوس پتھر کے قریب تھے جس کے پیچھے ٹاڈ نے بیٹھنے کی جگہ بنائی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ٹاڈ نے شیر سے بچنے کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کی اور چپ چاپ اس کا لقمہ بننا منظور کر لیا۔ پہاڑی کی طرف جانے والے راستے پر اس کے بائیں پیر کا جوتا ملا۔ ہم کچھ اور آگے گئے تو ایسے نشان دکھائی دیے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ شیر نے یہاں آ کر دم لیا اور اپنے شکار کو بھی منہ سے نکال کر زمین پر ڈالا۔ ممکن ہے وہ اسی جگہ ٹاڈ کو کھانا شروع کر دیتا، لیکن النسی کی چیخ پکار سے گھبرا کر اس نے ٹاڈ کو دوبارہ منہ میں دبایا اور پہاڑی کی طرف چل پڑا۔ خون کے دھبے جا بجا اس راستے پر پھیلے ہوئے تھے۔ صبح کے

"آپ نے آدم خور کو خود تو نہیں دیکھا؟"

"جی نہیں، البتہ اُس کے قدموں کے تازہ نشانات آج صبح ہم نے ضرور دیکھے ہیں۔ وہ تالاب پر پانی پینے گیا تھا اور وہاں اُس نے کچھ دیر آرام بھی کیا۔

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ قُلی آن پہنچے اور انھوں نے یہ خبر سُنائی کہ شیر نے بھینس کو ہلاک کر کے لاش کا آدھا حصّہ ہڑپ کر لیا ہے۔ اگرچہ شام کا اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا، لیکن انسی اور ٹاڈ اسی وقت جنگل میں جانے کے لیے تیّار ہو گئے اور انھوں نے ہمیں بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ ہم اُن ہی کی جیپ میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ جب ہم اس مقام پر پہنچے جہاں شیر نے بھینس کو ہلاک کیا تھا، تو مجھے فوراً معلوم ہو گیا کہ نوجوانوں نے بھینس کو اس جگہ باندھ کر سخت حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ شیر اگر اُسے نہ مارتا، تو مجھے حیرت ہوتی۔ یہ ایک کُھلی جگہ تھی، چاروں طرف بیس بیس اور چالیس چالیس من وزنی چٹانی پتّھر بکھرے ہوئے تھے۔ گھاس پھوس کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اور درخت بھی اِکّا دکّا ہی نظر آ رہے تھے۔ انسی اور ٹاڈ کا خیال تھا کہ اِنھی درختوں میں سے کسی ایک پر مچان باندھ کر شیر کا شکار کریں گے، لیکن بھینس کو انھوں نے جس درخت سے باندھا تھا، وہ اونچے اونچے چٹانی پتھروں سے گھرا ہوا تھا۔ مَیں نے اس رسّے کو دیکھا جس سے بھینس باندھی گئی تھی۔ شیر نے ڈیڑھ انچ قطر کے اِس مضبوط رسّے کو کچّے دھاگے کی مانند توڑ کر رکھ دیا تھا اور بھینس کو گھسیٹتا ہوا درخت سے کوئی دو فرلانگ دُور ایک بڑے ٹیلے کے پیچھے لے گیا تھا۔ اس سے مجھے اس کی بے پناہ قوت کا اندازہ ہوا۔ پیٹ بھرنے کے بعد شیر بھینس کی لاش کے کچھ حصّے ایسی جگہ چھوڑ گیا جہاں وہ کسی وقت بھی دوبارہ نمودار ہو سکتا تھا۔ ان حصّوں کو دیکھ کر مجھے کچھ ایسا احساس ہوا کہ یہ شیر آدم خور نہیں، بلکہ آدم خور کوئی اور ہے۔ یہاں سے ایک پگڈنڈی تو اُدھر جاتی تھی جہاں شیر نے دھوبی کو ہلاک کیا تھا۔ اور دوسری پگڈنڈی جنوب مشرق کی طرف ایک بلند پہاڑی کے عقب میں سے گزرتی تھی۔ شیر کو دیکھنے کے لیے ان بڑے بڑے چٹانی پتّھروں کے پیچھے چُھپنا پڑتا تھا جو ان دونوں پگڈنڈیوں کے کناروں پر دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو پتّھر بہت بڑے تھے اور ان کے پیچھے ایک ایک شکاری آسانی سے چُھپ سکتا تھا۔ چونکہ مقابلہ آدم خور سے تھا اور اُس کی مکّاری سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ آ کر بے خبری میں شکاری کو دبوچ لیتا۔ اس لیے انسی اور ٹاڈ نے آپس میں فیصلہ کیا کہ وہ مچان پر بیٹھنے کے بجائے اِن بڑے پتّھروں کے پیچھے چُھپ کر آدم خور کا انتظار کریں گے۔ پتّھروں کا درمیانی فاصلہ پچاس فٹ سے زیادہ نہ تھا۔

میں نے دبی زبان سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ خطرہ مول نہ لیں اور زمین پر بیٹھنے کے بجائے ان بلند پتھروں کے اوپر ہی بیٹھ جائیں تو آدم خور کے حملے سے کسی حد تک محفوظ رہ سکتے ہیں، مگر انہوں نے میرا مشورہ نہ مانا اور قلیوں کی مدد سے جلدی جلدی خاردار جھاڑیاں اکھاڑیں اور پتھروں کے چاروں طرف جمع کر کے ان کے اندر بیٹھنے کا انتظام کیا۔

ہم لوگ بنگلے پر واپس چلے آئے، لیکن ان بیوقوف شکاریوں کے لیے میں بڑا فکرمند تھا اور سوچ رہا تھا کہ ان کو بتائے بغیر کسی ایسی جگہ ٹھہر جاؤں جہاں سے فوری طور پر ان کی مدد کو پہنچنے میں آسانی رہے، لیکن یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ شیر کو میری موجودگی کا احساس ہو گیا تو وہ ادھر کا رخ نہ کرے گا اور بعد میں یہ نوجوان مجھے الزام دیں گے کہ میں نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی ہے۔ رات کا کھانا کھا کر میکنٹوش اور اس کی بیوی گاؤں والوں سے باتیں کرتے رہے۔ میں باہر برآمدے میں بیٹھا تصور ہی تصور میں ان شکاریوں کو پتھروں کے پیچھے چھپے ہوئے دیکھ رہا تھا اور دعا کر رہا تھا کہ انہیں کوئی گزند نہ پہنچے۔ ہوا جنوب مغرب کے رخ چل رہی تھی۔ اس لیے ایک میل دور سے فائرنگ کی آواز میرے کانوں تک پہنچنا ناممکن بات تھی۔ مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ کب رات کے گیارہ بج گئے۔ میکنٹوش اور اس کی بیوی اندر کمرے میں گہری نیند سو رہے تھے اور میں آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا، لیکن میرے کان جنگل کی طرف لگے ہوئے تھے۔ اس غنودگی کے عالم میں مجھے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ یہ آواز کبھی مسلسل آتی اور کبھی تھم جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص کلہاڑی درخت کے تنے پر مار رہا ہے۔ ٹھک...... ٹھک ٹھک...... ٹھک ٹھک۔
یہ آواز آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ میں اٹھا اور برآمدے سے باہر نکل آیا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ یہ کسی آدمی کے جوتوں کی آواز ہے جو تیز دوڑنے سے پیدا ہو رہی ہے۔ آہ! میرے خدشات حقیقت کا روپ دھار رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ دوڑنے والا نوجوان شکاریوں میں سے ایک ہے۔

میں نے قریب رکھی ہوئی رائفل اٹھائی، ٹارچ سنبھالی اور اسی طرف دوڑنے لگا جدھر سے آواز آ رہی تھی۔ پھر میں نے اسے سامنے سے آتا ہوا دیکھ لیا۔ وہ انسی تھا۔ اس کے کپڑے تار تار تھے اور پسینے میں ڈوبا ہوا ہانپ رہا تھا۔ وہ بدمست شرابی کی طرح لڑکھڑا کر دو تین مرتبہ گرا اور اٹھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ گرنے ہی والا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔

"تانا کہاں ہے؟" میں نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا، لیکن دہشت کے مارے اس کا

گڑھے میں دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کیے بیٹھ گئے اور اپنی اپنی رائفلیں سنبھال لیں۔ طے پایا کہ خطرے کے وقت تین سیٹیاں بجا کر ایک دوسرے کو خبردار کر دیا جائے گا۔

میں نے بھینس کو گڑھے سے کچھ فاصلے پر باندھ دیا اور گاؤں والوں کو رخصت کر کے ٹھیک پانچ بجے اس چٹان پر پہنچ گیا۔ جہاں مجھے لیٹ کر اس آدم خور کا انتظار کرنا تھا۔ دن بھر دھوپ میں تپنے کے بعد چٹان بے حد گرم تھی، اور جب میں وہاں لیٹا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے دہکتے کوئلے میرے نیچے بچھے ہیں۔ وقت گزرتا گیا۔ جنگل میں پُر ہول سناٹا طاری تھا حتیٰ کہ ابابیلیں بھی خاموش تھیں۔ تاروں بھری رات میں جنگل کی یہ خاموشی رفتہ رفتہ گہری ہوتی جارہی تھی اور میں چٹان پر لیٹا بدنصیب ٹاڈ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کے والدین اور رشتے داروں کو جب اس حادثے کی خبر ملے گی تو ان کا کیا حال ہوگا۔ مجھے نہ جانے یہ احساس بار بار کیوں پریشان کر رہا تھا کہ اس کی موت کا ذمّہ دار میں خود ہوں۔ میں اسی فکر میں گم تھا کہ سیٹی بجنے کی آواز نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ معمولی وقفوں کے بعد سیٹی تین مرتبہ بجی۔ میں نے رائفل سنبھالی، ٹارچ روشن کی، پتھر سے نیچے اُترا اور نہایت احتیاط سے دبے پاؤں قدم رکھتا ہوا گڑھے کی طرف چلا۔ چند منٹ بعد میں نے مسٹر اور مسز میکٹوش کو بھینس کے قریب کھڑے پایا۔ وہ صحیح سلامت تھی۔

"خیر تو ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" میکٹوش نے جواب دیا، "آئیے اب گاؤں کو چلیں۔ ٹھہرنا بے کار ہے۔ شیر نے ہمیں یہاں چھپے ہوئے دیکھ لیا ہے اور وہ ادھر کا رُخ نہ کرے گا۔"

"پورا واقعہ تو سناؤ۔"

مسز میکٹوش نے مختصر الفاظ میں بتایا کہ انھوں نے اپنے رُخ پر کسی جانور کے ہانپنے کی آواز سُنی اور کہنی مار کر اپنے خاوند کو ادھر متوجہ کیا۔ مسٹر میکٹوش چونکہ بھینس کی طرف منہ کیے بیٹھے تھے اور گڑھے میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ وہ آسانی سے رُخ پلٹ سکتے، اس لیے دوسری جانب مُنہ کرنے میں خاصی جدّ و جہد کرنی پڑی۔ پہلے تو انھیں کچھ نظر نہ آیا، لیکن جب غور سے دیکھا، تو معلوم ہوا کہ صرف چھ فٹ کے فاصلے پر ایک لمبا اور بڑا سا پتھر پڑا ہوا ہے۔

"مجھے خوب یاد تھا کہ جب ہم گڑھا کھود رہے تھے تو یہ پتھر یہاں نہ تھا،" مسز میکٹوش نے

کہا۔" لیکن میں نے غور سے دیکھا، تو معلوم ہوا کہ یہ شیر ہے جو اطمینان سے لیٹا اونگھ رہا ہے۔ یکایک اس نے حرکت کی اور سر اُٹھایا، اس کی آنکھیں اندھیرے میں تاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ دفعتہً وہ غرّایا اور آناً فاناً غائب ہو گیا۔"

"بہر حال آپ لوگوں کو اس طرح گڑھے سے باہر نہیں آنا چاہئے تھا۔ ممکن ہے شیر قریب ہی چھپا ہوا آپ کی نقل و حرکت دیکھ رہا ہو۔"

بھینس کو وہیں بندھا چھوڑ کر ہم ہوس درگا پہنچ گئے۔ اگلے روز صبح میں نے چند آدمیوں کو بھینس کی خبر لینے جنگل بھیجا۔ انھوں نے واپس آکر یہ خبر وحشت اثر سنائی کہ شیر نے بھینس کو چیر پھاڑ کر برابر کیا اور اوجھڑی، سر اور کھُروں کے سوا کچھ باقی نہیں چھوڑا۔ ہم اسی وقت موقع پر پہنچے۔ جو کچھ ہمارے آدمیوں نے بتایا وہ سچ نکلا۔ اِرد گرد کی زمین کا معاینہ کرنے کے بعد ثابت ہو گیا کہ بھینس کو ہڑپ کرنے کا کارنامہ ایک شیر اور شیرنی نے انجام دیا ہے، لیکن اب تیسرے شیر کی موجودگی کا امکان بھی پیدا ہو رہا تھا۔ عین ممکن ہے کہ شیر اور شیرنی کا یہ جوڑا مویشیوں پر حملہ کرتا ہوا اور تیسرا شیر صرف آدمیوں کا دشمن ہو۔ ہم نے اسی روز ایک اور بھینس کا انتظام کیا اور اسی راستے پر جہاں بھینس ہلاک ہوئی تھی، کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر دوسری بھینس کو درخت سے باندھ دیا۔ یہاں پھر زمین میں پہلے جیسا ایک گڑھا کھودا گیا۔ اس مرتبہ ہم نے مسز میکنٹوش کو منت سماجت کر کے بنگلے میں رہنے پر رضامند کر لیا اور ہم دونوں ضروری ساز و سامان سے لیس ہو کر مقررہ وقت پر گڑھے میں اُتر گئے۔ ہمارے آدمیوں نے گھاس پھونس اور سوکھی شاخوں سے اُس کا مُنہ بند کر دیا اور اوپر سے ترپال ڈال دی۔ ہم نے باہر جھانکنے کے لیے سوراخوں کا پہلے سے انتظام کر لیا تھا۔

یقین کیجیے کہ ہم تین راتیں اس زمیں دوز قبر میں بیٹھے انتظار کرتے رہے کہ کون سا شیر بھینس پر حملہ کرتا ہے، لیکن بے سُود۔ شیر آس پاس پھرتے تھے، ان کی آوازیں بھی ہم سُنتے تھے، لیکن بھینس کے قریب کوئی نہ پھٹکتا تھا، شاید انھیں ہماری موجودگی کا کسی طرح پتہ چل جاتا تھا۔ اس عجیب صورتِ حال نے ہمارا ذہن ہلا کر رکھ دیا۔

چوتھے روز صبح دس بجے ہم اپنے بنگلے کے برآمدے میں لیٹے رات کی نیند پوری کر رہے تھے کہ ہمیں جگایا گیا اور یہ خبر سُنائی گئی کہ ہولکمے سے ایک میل دور کھجور کے درختوں کے اسی تاریک جھنڈ میں جہاں مسز میکنٹوش نے ایک ریچھ کو مارا تھا، آدم خور نے ایک آدمی کو مار ڈالا ہے۔ ہم جتنی جلدی وہاں پہنچ سکتے تھے، پہنچے، لیکن یہ دیکھ کر ہمارے صدمے اور غصّے کی انتہا نہ رہی کہ مرنے والے کے

رشتے دار اس کی لاش کے حصے اُٹھا کر لے جا چکے تھے۔ گویا آدم خور کے دوبارہ نمودار ہونے کا امکان ہی ختم ہو چکا تھا۔ ایک اور بھینس خرید کر اس مقام سے پچاس گز کے فاصلے پر باندھی گئی جہاں آدم خور نے اس شخص کو ہلاک کیا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک اونچے اور مضبوط درخت پر مچان باندھی گئی لیکن میکوٹش نے اس روز میرا ساتھ دینے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہ گزشتہ چار راتوں سے نہیں سو سکا ہے اور اب آرام کرنا چاہتا ہے۔ میں تمام رات اکیلا اُلوؤں کی طرح مچان پر بیٹھ کر آدم خور کا انتظار کرتا رہا اور جب سورج نکلنے کے آثار ظاہر ہوئے تو مچان سے اُتر کر تھکن، مایوسی اور صدمے کی مجسم علامت بنا ہولکر پہنچا اور اپنے آدمیوں سے کہا کہ وہ بھینس کو کھول کر لے آئیں۔ آدھ گھنٹے بعد وہ لوگ انتہائی بدحواس اور خوف زدہ حالت میں آئے اور بتایا کہ جب وہ بھینس کھول رہے تھے، تو چند گز کے فاصلے پر جھاڑیوں میں سے شیر کے غرّانے کی آواز سنائی دی۔ ان بیوقوفوں نے بھینس کو وہیں چھوڑا اور خود بھاگ آئے۔ اگرچہ میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا، لیکن یہ موقعہ شاید پھر نہ ملتا۔ میں نے میکوٹش کو موٹر نکالنے کی ہدایت کی اور پندرہ منٹ بعد جب ہم اسی جگہ پہنچے، تو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ بھینس ابھی تک زندہ سلامت ہے۔ حالانکہ مجھے یقین تھا کہ آدمیوں کے بھاگتے ہی شیر نی یا شیر ہی جھاڑیوں سے نکل کر بھینس کا قصہ پاک کر چکا ہوگا۔ ایک بجے دوپہر تک ہم مچان پر بیٹھے رہے لیکن شیر کی آواز سنائی نہ دی۔ تنگ آ کر ہم نے بھینس کھولی اور اسے لے کر ہولکر پہنچ گئے۔ اس رات یہ طے ہوا کہ میکوٹش اور اس کی بیوی موٹر میں ہولکر سے گاؤں جائیں اور اسی گڑھے میں چھپ کر بیٹھ جائیں جہاں ایک بھینس پہلے بندھی ہوئی ہے اور میں پھر اس مچان پر پہرہ دوں گا، لیکن یہ رات بھی بے کار گئی۔ صبح ساڑھے چھ بجے دونوں اپنی کار میں ہوس درگا سے آئے اور مجھے مچان سے اتار کر ہولکر لے گئے اور بتایا کہ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ وہاں بندھی ہوئی بھینس بھی صحیح سلامت ہے۔

شام کو چار بجے جب کہ ہم خرّاٹے لے رہے تھے، بنگلے کے باہر آدمیوں کا بے پناہ غُل غپاڑہ سُن کر آنکھ کھل گئی۔ معلوم ہوا کہ گاؤں کے کچھ لوگ اپنے مویشیوں کو بیچنے کے لیے جینتل ڈروگ لے جا رہے تھے کہ ہولکر سے تین میل کے فاصلے پر جھاڑیوں میں چھپا ہوا ایک شیر پیچھے سے نکلا، ایک آدمی پر جھپٹا، اسے گرایا اور پھر گردن منہ میں دبا کر نہایت فاتحانہ انداز سے چلتا ہوا جنگل میں غائب ہو گیا۔ بیس پچیس آدمیوں کا یہ گروہ دہشت سے یہ خونین کارروائی

دیکھتا رہا اور کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ آدم خور کو للکارتا یا اپنے ساتھی کی جان بچانے کی کوشش کرتا۔ جب آدم خور اسے لے گیا، تو ان لوگوں کی جان میں جان آئی، یہ چیختے چلاتے گاؤں کی طرف واپس آ گئے، اور اب ہمارے بنگلے کے سامنے کھڑے مطالبہ کر رہے ہیں کہ انہیں آدم خور سے نجات دلائی جائے۔

میں نے ان لوگوں سے کہا کہ اگر وہ لاش دریافت ہونے کے بعد اسے وہیں پڑا رہنے دیں، تو میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔ انھوں نے وعدہ کیا، تو ہم نے اپنی رائفلیں سنبھالیں، موٹر میں بیٹھے اور چند منٹ کے اندر اندر جائے حادثہ پر پہنچ گئے۔ شیر نے جس جگہ اس بدنصیب شخص کو گرایا تھا، وہاں خون کے تازہ دھبے دکھائی دیے اور جس طرف شیر اسے لے گیا، اس طرف بھی کہیں کہیں خون کے دھبے موجود تھے۔ شام کے پانچ بج رہے تھے اور ابھی سورج غروب ہونے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ جب ہم ان دھبوں کا سراغ لگاتے ہوئے گھنے جنگل میں داخل ہوئے تو ہمیں ایک جگہ اس کے پھٹے ہوئے اور خون میں لت پت کپڑے دکھائی دیے۔ آدم خور نے جس جگہ اُسے مُنہ سے نکال کر ڈالا تھا، وہاں خون بڑی مقدار میں گرا تھا۔ ہم نے چھ فرلانگ کا فاصلہ طے کر لیا تھا، لیکن یہ سوچ کر بار بار مجھے تعجب ہوتا کہ آدم خور نے اتنی دور نکل جانے کے باوجود اپنے شکار کو ہڑپ نہیں کیا، بلکہ آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ اس راہ میں ایک مقام ایسا تاریک اور گنجان بھی تھا جہاں آدم خور اطمینان سے اپنا پیٹ بھر سکتا تھا، لیکن وہ یہاں بھی نہیں رُکا۔ جنگل کا حصہ انتہائی خطرناک، گنجان ترین اور تاریک تھا۔ ہم اب تاریکیوں کی روشنی میں پھونک پھونک کر قدم بڑھا رہے تھے۔ ایک اونچے ٹیلے کے گرد، جہاں آٹھ آٹھ فٹ اونچی گھنی، خاردار جھاڑیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں، ہم نے اس آدمی کی لاش اس حال میں پائی کہ شیر اس کا تیسرا حصہ کھا چکا تھا۔

وقت پر لگا کر اُڑ رہا تھا اور میں اس فکر میں تھا کہ اس موقع سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے۔ دور و نزدیک کوئی درخت ایسا نہ تھا کہ جس پر چڑھ کر آدم خور کا انتظار کیا جاتا۔ بار بار میری نظریں اس چٹان کی طرف جاتیں جس کی اونچائی بارہ فٹ تھی۔ اس چٹان کی دیواریں تین طرف سے بالکل سیدھی تھیں اور شیر ان پر کسی طرح نہیں چڑھ سکتا تھا، البتہ چوتھی دیوار اس زاویے سے مڑی ہوئی تھی کہ شیر ادھر سے باآسانی اوپر آ سکتا تھا۔ بہرحال یہ خطرہ مول لیے بغیر چارہ نہ تھا۔ میں نے چٹان پر چڑھ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ لاش یہاں سے نظر بھی نہیں آتی۔ اس کا

مطلب یہ تھا کہ اگر میں چٹان پر لیٹ جاؤں اور شیر چپکے سے آکر لاش کو ہڑپ کرنا شروع کر دے، تو جب تک اس کی آواز میرے کانوں میں نہ آئے گی، میں اس کی موجودگی سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ وہ چوتھی طرف سے دبے پاؤں آکر مجھے دبوچ بھی سکتا ہے۔ مجھے خوب احساس تھا کہ آدم خور کتنا قوی اور پھرتیلا ہوگا! دو بارہ فٹ اونچی چھلانگ لگا کر مجھے گھسیٹ لے جانا اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔

میں نے میکٹوش کو یہ نازک پوزیشن سمجھائی اور اسے مشورہ دیا کہ وہ میرے ساتھ اس ٹیلے پر وقت ضائع کرنے کے بجائے اگر اپنی موٹر میں ہولکر اور رہوس ڈرگا کے دریائی راستے پر آدھی رات تک معمولی وقفوں کے بعد چکر لگاتا رہے، تو ممکن ہے آدم خور کا اس سے آمنا سامنا ہو جائے یا وہ ڈر کر اس ٹیلے کی طرف آنکلے۔ دونوں صورتوں میں ہم اسے رائفل کا نشانہ بنا سکیں گے۔ میکٹوش کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور مجھے وہ خدا کے سپرد کر کے رخصت ہوا۔ تنہائی کا احساس ہوتے ہی میرے قلب کی عجیب کیفیت ہوئی۔ اس قسم کی سیکڑوں مہمیں پہلے سر کر چکا تھا، لیکن نہ معلوم کیا بات تھی کہ اُس رات رہ رہ کر دل دھڑکتا اور رونگٹے آپ ہی آپ کھڑے ہو جاتے تھے۔ دراصل میری چھٹی حس بیدار ہو رہی تھی اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ خطرہ میرے ارد گرد منڈلا رہا ہے۔ میں چٹان پر بے حس و حرکت لیٹا تھا۔ کبھی کبھی آنکھیں گھما کر دائیں جانب تاریکی میں گھورتا، تو جنگلی جھاڑیاں حرکت کرتی ہوئی نظر آئیں جیسے مجھے گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہی ہوں۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے ٹھیک دس بجے تھے۔ یکایک جنگل میں غالباً ایک میل دور کوئی سانبھر پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلایا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ڈرامے کا آغاز ہو چکا تھا، کیونکہ ایک منٹ کے بعد ہی شیر کے بولنے کی آواز سنائی دی جس کے جواب میں سڑک کی طرف سے دوسرا شیر غرایا۔ یہ آوازیں سُن کر میرے دل میں دو شیروں کے بارے میں جو رہا سہا شبہہ تھا وہ بھی جاتا رہا۔ ان میں سے ایک یقیناً آدم خور تھا اور دوسرا مویشیوں کو اٹھالے جانے والا۔ اس کے باوجود اس علاقے میں تیسرے شیر کے وجود کا امکان بھی بعید از قیاس نہ تھا۔ شیروں کے بولنے سے جنگل کی خاموش فضا میں ارتعاش سا پیدا ہوا۔ جنگلی ہرن، بکرے اور سانبھر وغیرہ ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ اپنے اپنے گھونسلوں میں دبکے ہوئے سینکڑوں پرندے فضا میں پرواز کرنے لگے۔ اُلّو مسلسل ہو ہو کر رہے تھے اور ان تمام آوازوں کے ساتھ پورب کی طرف چلنے والی

تیز ہوا جب جھاڑیوں کے اندر سے سیٹیاں بجاتی ہوئی گزرتی، تو یوں محسوس ہوتا جیسے بدروحیں بین کر رہی ہیں، لیکن کتنی عجیب بات تھی کہ شیروں کے چپ ہوتے ہی یہ سارا ہنگامہ یک لخت یوں رُک گیا جیسے برپا ہی نہ ہوا تھا۔

آدم خور کا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پتھرا گئیں، اعصاب جواب دینے لگے اور میں آنکھیں بند کر کے دوبارہ لیٹا ہی تھا کہ میری پشت پر عجیب سی آواز بلند ہوئی۔ یقین کیجیے، اگر میں قلابازی کھانے میں ایک سکنڈ کی بھی تاخیر کرتا، تو وہ مجھے منہ میں دبا کر کبھی کا رفوچکر ہو جاتا۔ وہ میری بے خبری سے فائدہ اُٹھا کر چپکے چپکے ٹیلے کی طرف آیا، چاروں طرف گھوما اور پھر اس نے معلوم کر لیا کہ "شکار" دبوچنے کا کون سا راستہ آسان رہے گا۔ نظروں ہی نظروں میں بارہ فٹ کا فاصلہ بھانپ کر اُس نے پوری قوت سے جست کی، اس کا دایاں پنجہ میرے مضبوط جوتے کو چیرتا ہوا نکل گیا، ایک پُرشور آواز کے ساتھ وہ نیچے گرا اور دھاڑتا ہوا جنگل میں غائب ہو گیا۔ دہشت سے خون میری رگوں میں جم گیا اور روح سمٹ کر گویا میرے کلیجے میں آ گئی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میری کون سی نیکی اس وقت کام آ گئی تھی کہ آدم خور کا لقمہ بننے سے بار بار بچ گیا۔ بہرحال میں دل ہی دل میں اس موذی کی عیاری اور پھرتی کی داد دیتا رہا، لیکن صبح تک یہ کیفیت رہی کہ معمولی سی آہٹ یا آواز پر چونک اُٹھتا اور ہر طرف مجھے شیر ہی شیر کھڑے نظر آتے۔ جب سورج خاصا بلند ہو گیا، تو میں ٹیلے سے اُترا۔ آدم خور کو لاش کا بقیہ حصہ ہڑپ کرنے کی شاید جرأت نہ ہوئی۔ وہ ویسے ہی پڑی تھی۔ میں نے اُسے گدھوں سے بچانے کے لیے گھاس پھونس سے ڈھانپ دیا۔ کیونکہ رات کو پھر یہاں آنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

بنگلے پر پہنچ کر میکنٹوش کو اپنی ناکامی اور آدم خور کے حملے کی خبر سُنا ہی رہا تھا کہ پوس درگا سے آدمیوں کی ایک جماعت آن پہنچی اور بتایا کہ ہم نے جو بھینس گڑھے کے قریب باندھی تھی اُسکا تیا پانچا ہو چکا ہے۔ یہ خبر سُن کر جی چاہا کہ کپڑے پھاڑ ڈالوں اور دیواروں سے ٹکرا کر جان دیدوں۔ ذہن کام ہی نہیں کر رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم مشرق کی طرف دوڑتے تھے، تو واردات مغرب میں ہوتی تھی، اور مغرب کی طرف جاتے تھے، تو حریف شمال کی طرف کھڑا ہماری بےبسی پر قہقہے لگاتا۔

شام ہوتے ہی ہم پھر بےحیا شکاریوں کی طرح اسی گڑھے پر کھڑے بھینس کی لاش کا معاینہ کر رہے تھے۔ شیر نے اس کی اوجھڑی نکال کر باہر پھینک دی تھی اور گوشت کسی اور وقت

کھانے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ اس اُمید پر کہ شیر ضرور آئے گا، ہم آدھی رات تک گڑھے میں دبکے رہے۔ کوئی ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ شیر کی آواز سُنائی دی، ہم نے سانس روک لیے اور شیر کی آمد کا بے صبری سے انتظار کرنے لگے، لیکن آدھ گھنٹے تک بولنے اور اِدھر اُدھر جھاڑیوں میں حرکت کرنے کے باوجود وہ لاش پر آنے سے کتراتا رہا۔ ہماری طرف سے بے چینی اور اضطراب دم بدم بڑھتا جاتا تھا۔ دفعتہً میکوٹش نے اپنے اوپر سے گھاس پھونس ہٹائی اور باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے سختی سے اس کی ٹانگ پکڑی اور ڈانٹا:

"یہ کیا حماقت سوجھی ہے؟"

"یار میں اس روز روز کی جھک جھک سے تنگ آ گیا ہوں۔" اس نے جھلا کر کہا۔ "آؤ تم بھی باہر نکلو، ہم دونوں اونچی آواز سے آپس میں باتیں کرتے ہوئے ایک طرف چلیں گے اور چپکے سے اسی گڑھے میں آ کر دبک جائیں گے۔ شیر یہ سمجھے گا کہ ہم چلے گئے ہیں، پھر وہ لاش پر آئے گا۔"

میں نے ایک لمحے کے لیے اس تدبیر پر غور کیا۔ کچھ شک نہیں کہ یہ عام حالات میں کارگر ثابت ہوتی، مگر ہمارا واسطہ آدم خور سے تھا؛ چنانچہ میں نے میکوٹش کے ایک دو ہنٹر رسید کیا۔ آئندہ تمھیں ساتھ لانے والے پر ہزار لعنت۔ کیا کہنے ہیں اس دلیری کے۔ اِدھر تم نے گڑھے سے باہر قدم رکھا اور اُدھر آدم خور نے تمھاری گردن ناپی۔ میرے بھائی فرض کرو آس پاس دو شیر پھر رہے ہوں اور ان میں سے ایک آدم خور ہو تو ہم کیا کر سکیں گے؟ اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط کرنے کے بجائے چپ چاپ یہیں بیٹھے رہو۔"

صبح تک شیر مسلسل غُرّاتا رہا، لیکن لاش کے نزدیک نہ آیا۔ اُسے نہ جانے کیسے پتہ چل جاتا تھا کہ ہم لوگ گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ صبح ہوتے ہی شیر اپنے ٹھکانے پر چلا گیا۔ اور ہم منہ لٹکائے اپنے بنگلے پر پہنچ گئے۔ اگلے دو دن تک کسی واردات کی خبر سننے میں نہ آئی۔ البتہ ہم موٹر لے کر رات رات بھر ہوس دُرگا، ہولکر، اور چیتل دُرگ کی درمیانی سڑکیں ناپتے رہے۔ سچ پوچھئے تو کھانا پینا اور سونا سب چھوٹ گیا تھا اور دُھن تھی تو یہی، کہ موذی سے ایک بار آمنا سامنا ہو، لیکن وہ ہر بار طرح دے جاتا تھا۔

تیسرے روز صبح ہی صبح چند لکڑہاروں نے گاؤں میں آ کر بتایا کہ گذشتہ رات ایک شیر نے ان کے "کیمپ" پر حملہ کیا اور ایک بیل کو زخمی کر کے بھاگ گیا۔ یہ لکڑہارے ہوس دُرگا سے چار میل دور جنگل کے اندرونی حصے میں لکڑیاں کاٹ رہے تھے۔ ان کے پاس پانچ بیل گاڑیاں تھیں۔

رات کو انھوں نے پانچوں گاڑیاں ایک دائرے کی شکل میں کھڑی کیں اور ان کے باہر آگ کے الاؤ روشن کر دیے اور خود اطمینان سے سو گئے۔ پچھلے پہر یکایک بیلوں کی اچھل پھاند اور شیر کی گرجدار آواز سے بیدار ہوئے، دیکھا کہ بجھتی ہوئی آگ، اور مدھم روشنی میں ایک بڑا شیر بیلوں سے گتھم گتھا ہے۔ لکڑہاروں نے فوراً کوئلے اور جلتی ہوئی لکڑیاں اس کی طرف پھینکیں تو شیر بھاگ نکلا، لیکن جاتے جاتے ایک بیل کو ادھ موا کر گیا۔

ان لکڑہاروں میں سے ایک آدمی ایسا تھا جس کو اس جنگل کے چپے چپے کا اچھی طرح علم تھا۔ اس نے مجھے بتایا:

"صاحب، جس مقام پر شیر نے ہم پر حملہ، وہاں سے چھ میل دور جنگل کے عین بیچوں بیچ ایک برساتی ندی ہے جو اردگرد کی پہاڑیوں کے گرد چکر کاٹتی ہوئی ایک تالاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ گرمیوں میں یہ مقام انتہائی سرد اور آرام دہ بن جاتا ہے اور جنگل کے اکثر درندے دن بھر یہیں آرام کرتے اور پانی پیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آجکل بھی شیر وہیں رہتے ہیں، کیونکہ کئی مرتبہ صبح سویرے یا شام کو گھر لوٹتے وقت میں نے ادھر ان کے پنجوں کے نشان دیکھے ہیں۔ یہ جگہ بہت گنجان اور تاریک بھی ہے اور بہت کم لوگوں نے دیکھی ہوگی۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو لے چلتا ہوں۔"

اس شخص کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ واقعی اس جنگل کے بارے میں اس کی معلومات وسیع ہیں، چنانچہ ہم نے اس سے طے کر لیا کہ دوپہر کو کھانے کے بعد اس کے ساتھ وہاں چلیں گے۔ سہ پہر کے تین بجے تھے کہ ہم اس تالاب پر پہنچ گئے، یہ ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس کے چاروں طرف اونچے پہاڑی ٹیلے کثرت سے تھے۔ ہم نے اس ندی کا بھی معاینہ کیا جو اس تالاب پر آن کر ختم ہو جاتی تھی۔ اس کے کناروں پر شیر اور شیرنی کے پنجوں کے تازہ نشانات فوراً نظر آئے اور اطمینان ہو گیا کہ ہم غلط جگہ پر نہیں آئے۔ تالاب کے بالکل قریب، جہاں ندی کا پانی اس میں گرتا تھا، آم کا ایک بہت بڑا اور گھنا درخت کھڑا تھا اور مچان باندھنے کے لیے بے حد موزوں۔

ہم نے پندرہ فٹ کی بلندی پر مچان باندھی۔ یہ مچان دراصل ایک چارپائی تھی۔ جو اسی مقصد کے لیے لکڑہارا اپنے سر پر اٹھا کر گاؤں سے لایا تھا۔ مچان بندھ چکی تھی تو لکڑہارے نے واپس جانے کا ارادہ کیا، لیکن میں نے اسے روک لیا۔ شام کے وقت اسے تن تنہا بھیجنا حماقت تھی کیونکہ آدم خور جنگل میں موجود تھا۔ جو یقیناً اس بیچارے کا گلا دبا دیتا۔ ہم نے اپنے ساتھ اسے بھی مچان پر بٹھا لیا۔ سورج غروب ہونے کے فوراً بعد جنگل میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ سناٹا تو پہلے ہی طاری

تھا۔ جنگل کے بادشاہ کے خوف سے کسی اور جانور کو ادھر آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وقت گزرتا گیا، کوئی آواز، کوئی آہٹ سُنائی نہ دی۔ صبح کاذب کے وقت سانبھر کے بولنے کی آواز آئی اور ہم اشارہ پاکر چوکنے ہوگئے۔ چار بجے کے لگ بھگ ہم نے دائیں جانب ایسی آواز سُنی جیسے کوئی جانور بانس کے گرے ہوئے خشک پتوں پر آہستہ آہستہ چل رہا ہو۔ پھر شیر کے ہانپنے کی مانوس آواز کانوں میں آئی۔ ہم نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی، مگر کچھ نظر نہ آیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر کچھ یوں احساس ہوا جیسے شیر تالاب کے کنارے کھڑا پانی پی رہا ہے۔

آخر وہ نازک گھڑی آن پہنچی جس کا ہمیں ہفتوں سے شدید انتظار تھا۔ میں نے میکٹوش کو اشارہ کیا کہ پہل کرے۔ اس نے فوراً ٹارچ روشن کی اور اردگرد کا منظر عیاں ہوگیا۔ ہم نے دیکھا کہ روشنی ہوتے ہی درندے نے ہماری طرف نگاہ کی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کی آنکھوں کے سُرخ و سفید حلقے بڑے بھیانک نظر آرہے تھے۔ اسی لمحے میکٹوش کی رائفل سے گولی نکلی اور درندہ دل دوز چیخ مار کر پیچھے اُلٹ گیا۔ زمین پر اُس کا لوٹنا، اُچھلنا، اور پوری قوت سے گرجنا آج تک یاد ہے۔ اس کی دُم تیزی سے گردش کررہی تھی۔ یکایک اس نے چھلانگ لگائی اور درخت کی طرف آیا، مگر فوراً میکٹوش نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے اور درندہ پھر قلابازی کھا کر پیچھے ہٹ گیا اور تالاب کے عین کنارے چند منٹ تڑپنے کے بعد بے حس و حرکت ہوگیا۔

ہمیں اس وقت مچان سے اُتر کر اس کے قریب جانے کی جرأت نہ ہوئی۔ جب سورج نکل آیا، تو اس کے قریب گئے۔ اس کا آدھا دھڑ پانی سے باہر تھا۔ نہایت خوبصورت اور شاندار شیر تھا۔ میکٹوش کی پہلی گولی اس کی ناک پر لگی جس نے اس کا جبڑا بیکار کردیا اور گلے میں پیوست ہوکر رہ گئی۔ اور دوسری گولی اس کے بائیں کندھے میں لگی تھی اور تیسرا نشانہ خالی گیا۔ جب ہم نے اس کے پنجوں اور دانتوں کا معاینہ کیا، تو کچھ شک سا گزرا کہ یہ شیر آدم خور نہیں ہوسکتا۔ بہرحال میکٹوش سے ذکر کیے بغیر جب ہم اس کی لاش لے کر گاؤں پہنچے تو گاؤں والوں کے جوش و خروش اور مسرت کی انتہا نہ رہی۔ فوراً ہی آدم خور کے مارے جانے کی خبر ہر جگہ پھیل گئی اور اسے دیکھنے کے لیے لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ عجیب بات یہ تھی کہ ان چار دنوں میں کوئی نئی واردات بھی نہ ہوئی اور میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوگیا کہ آدم خور یہی ہوگا۔

گاؤں کے لوگ اب اطمینان سے جنگل میں آنے جانے لگے اور وہ رونق جو آدم خور کی وحشیانہ سرگرمیوں کے باعث جاتی رہی، دوبارہ لوٹ آئی۔ لیکن ان کا یہ اطمینان اور خوشی

عارضی ثابت ہوئی کیونکہ چھٹے روز ہی جیتیل ڈُروگ سے یہ خبر ملی کہ وہاں ایک چودہ سالہ لڑکے کو آدم خور اٹھا کر لے گیا۔ یہ حادثہ جوگی مت کی پہاڑی ڈھلوانوں کے قریب پیش آیا جو جیتیل ڈُروگ کے جنوب میں واقع ہیں اور یہاں صدیوں پرانے قلعے کے کھنڈر ہی موجود ہیں۔

ہم اسی وقت اپنی موٹر میں بیٹھے اور جیتیل ڈُروگ روانہ ہوگئے۔ ہمیں وہ جھونپڑی دکھائی گئی جس کے اندر گھس کر آدم خور نے سوئے ہوئے لڑکے کو منہ میں دبایا اور پہاڑی کی طرف بھاگ گیا تھا۔ لوگوں کے بیانات سے اندازہ ہوا کہ آدم خور لاش کو قلعہ کے کھنڈروں میں لے گیا ہے اور ممکن ہے اب بھی وہیں موجود ہو۔ اس دوران میں کسی شخص نے بھی اُدھر جانے کی ہمت نہیں کی تھی۔ جیتیل ڈُروگ کے جنوب کا علاقہ پہاڑی اور بے آب وگیاہ ہے۔ ہر طرف خشک اور سنگلاخ چٹانیں پھیلی ہوئی ہیں، ہم نے بیس پچیس آدمیوں کو ساتھ لیا اور لاش کی تلاش میں کھنڈروں کی طرف بڑھنے لگے۔ لیکن بہت جلد پتہ چل گیا کہ آدم خور اپنے شکار کو لے کر اس طرف نہیں گیا۔ ایک جگہ رُک کر میں نے ان آدمیوں کو پانچ پانچ کے گروپ میں تقسیم کر کے ہدایت کی کہ وہ چاروں طرف پھیل کر ایسے نشانات تلاش کریں جن سے معلوم ہو کہ آدم خور کس طرف گیا ہے۔ ایک گھنٹے بعد خبر ملی کہ بائیں جانب سے چوتھائی میل دُور ایک ٹنڈ منڈ درخت پر بہت سے گدھ بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہاں لاش ضرور پڑی ہے۔ پتھروں کو پھلانگتے اور خاردار جھاڑیاں عبور کرتے ہوئے جب ہم وہاں پہنچے، تو لڑکے کی ہڈیوں اور کھوپڑی کے سوا کچھ نہ تھا۔ آدم خور کے پیٹ بھرنے کے بعد رہی سہی کسر گدھوں اور چیلوں نے پوری کر دی تھی۔ اُمید تو نہ تھی کہ آدم خور ان بچی کچھی ہڈیوں پر دوبارہ آئے گا، لیکن اس کی فطرت کا اندازہ کرتے ہوئے ہم نے اسی درخت پر مچان بندھوانے کا فیصلہ کیا جو تھوڑی دیر پہلے گدھوں کے اڈّے کا کام دے رہا تھا۔

چھ آدمی ہمارے ساتھ تھے۔ میں نے دو کو میکنٹوش کے ساتھ چٹان پر بیٹھنے کی ہدایت کی اور چار آدمیوں کو اپنے ہمراہ لے کر قلعہ کے کھنڈروں کی طرف چلا۔ سورج غروب ہونے میں ایک گھنٹہ باقی تھا، اس لئے ان کھنڈروں کو دیکھنے بھالنے کا موقع ہاتھ سے دینا نہ چاہتا تھا۔ یہ راستہ انتہائی دشوار گذار اور خطرناک تھا اور جب میں نے محسوس کیا کہ میرے ساتھی آگے بڑھنے سے کترا رہے ہیں اور بار بار واپس چلنے کا مشورہ دے رہے ہیں، تو میں نے ایک جگہ رُک کر انھیں انتظار کرنے کی ہدایت کی اور خود پتھروں کو پھلانگتا ہوا اور جھاڑیوں میں الجھتا پھلانگتا

قلعے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہاں وحشت انگیز سناٹا جاری تھا اور فضا میں عجیب طرح کی ناگوار بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

میں برسوں پہلے بھی ایک مرتبہ یہ کھنڈر دیکھنے آیا تھا۔ لیکن یہ اب بھی ویسی ہی حالت میں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لیل و نہار کی گردش سیاہ پتھر-لی دیواروں، جھکے ہوئے ستونوں اور جھکی ہوئی چھتوں پر کچھ زیادہ اثرانداز نہیں ہوئی۔ مغرب کی طرف لمحہ بہ لمحہ جھکتے ہوئے سورج کی زرد کرنوں میں یہ کھنڈر عجب ڈراؤنا منظر پیش کر رہے تھے۔ میں ایک پتھر پر بیٹھ کر سانس درست کرنے اور پسینہ پونچھنے لگا۔ معاً میری چھٹی حس بیدار ہوئی اور اس نے خطرے کا اعلان کیا۔ میں نے بھری ہوئی رائفل کے ٹریگر پر انگلی رکھ دی اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مجھے اپنی قوتِ سماعت پر بڑا اعتماد تھا اور اسی کی بدولت کئی مرتبہ میری جان بچی تھی۔ میں نے اپنے دائیں جانب گھنی جھاڑیوں میں ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ کی آواز سُن لی تھی اور اب میں بے حس و حرکت اپنی جگہ بیٹھا آنکھیں گھما کر اُدھر ہی دیکھ رہا تھا۔ میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں جھاڑیوں کا فاصلہ ناپ لیا۔ وہ مجھ سے تیس گز دور تھیں اور اُن میں چھپا ہوا آدم خور نہایت مکاری سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنی فطرت کے مطابق مجھے بے خبری میں دبوچ لینا چاہتا تھا۔

اب وہ مجھ سے بیس گز دُور تھا........ پندرہ گز........ بارہ گز...... دس گز...... یکایک اس نے اپنا سر اُٹھایا اور میں نے دیکھا کہ وہ شیرنی ہے۔ پھر جبڑا کھول کر وہ آہستہ سے غرائی، میں نے اس کے چمکتے ہوئے لمبے دانت دیکھے اور اس سے پیشتر کہ وہ مجھ پر چھلانگ لگائے، میری گولی اس کا جبڑا توڑتی ہوئی گردن میں سے نکل گئی، لیکن کس بلا کی قوت اس کے اندر کام کر رہی تھی۔ وہ زخمی ہونے کے باوجود اندھا دھند میری طرف جھپٹی، لیکن مجھ سے صرف دو گز کے فاصلے پر آن کر گری اور پھر دھاڑتی گرجتی اُلٹے قدموں بھاگی۔ میں نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ اس کی گردن سے اُبلتا ہوا خون صاف غمّازی کر رہا تھا کہ وہ کدھر گئی ہے۔

مجھے اتنا یاد ہے میرے نشانے خالی نہیں گئے اور شیرنی آگے جا کر یقیناً گر گئی ہوگی، لیکن میری کیفیت یہ تھی کہ بدن تھر تھر کانپ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں بیہوش ہونے والا ہی ہوں۔ میں گرتا پڑتا اور جھاڑیوں میں سے لہو لہان ہو کر اس درخت تک پہنچ گیا جہاں میرے ساتھی موجود تھے۔ انھوں نے شیرنی کے گرجنے اور فائروں کی آوازیں سُن لی

تھیں اور اب یہ سوچ رہے تھے کہ آیا انھیں میری تلاش میں جانا چاہیئے یا نہیں۔ دراصل وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ میں زندہ واپس نہیں آسکوں گا۔ انھوں نے مجھے سنبھالا اور ابھی ہم ایک فرلانگ گئے ہوں گے کہ میکنٹوش اور دوسرے دو آدمی بھاگتے ہوئے ہماری طرف آتے نظر آئے۔ انھوں نے بھی فائروں کی آوازیں سن لی تھیں۔ میکنٹوش نے مجھے زخمی دیکھا تو وہ یہی سمجھا کہ آدم خور نے مجھے چبا ڈالا ہے اور میں کوئی دم کا مہمان ہوں۔ میں نے اُسے تسلی دی اور سارا قصہ سُنایا۔ چند لمحے آرام کرنے کے بعد ہم سب پھر قلعے کی طرف چلے۔ اس مرتبہ میکنٹوش آگے آگے تھا اور پیچھے گاؤں والے لالٹینیں لیے چل رہے تھے۔ شیرنی کے جسم سے جا بجا گرا ہوا خون ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ جس مقام پر اس نے مجھ پر حملہ کیا تھا، وہاں سے صرف ساٹھ گز دور جھاڑیوں میں خون بہت زیادہ مقدار میں دیکھا گیا۔ اس سے پتہ چلا کہ زخمی شیرنی یہاں رُکی تھی۔ میکنٹوش اندھا دُھند آگے بڑھ گیا تھا۔ کئی مرتبہ میں نے اُسے روکنے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ جھاڑیوں میں سے راستہ بناتے ہوئے اُس کے کپڑے بھی چھلنی ہو رہے تھے۔ اور چہرے، بازوؤں اور ٹانگوں پر بے شمار خراشیں آچکی تھیں۔

ایک جگہ وہ اچانک رُکا اور پھر پیچھے ہٹ کر چند پتھر اُٹھائے اور جھاڑی کے اندر پھینکنے لگا۔ غالباً آدم خور شیرنی اُس کے اندر چھپی ہوئی تھی۔ پھر وہ رائفل تان کر آگے بڑھا اور میں نے ٹارچ روشن کی۔ اُسی لمحے زخمی شیرنی نے کروٹ لی اور میکنٹوش کے اوپر چھلانگ لگائی، لیکن چند فٹ کے فاصلے پر ہی آ کر گر پڑی۔ اور جبڑا کھول کر غرّانے لگی۔ ہمارے ساتھی لالٹینیں پھینک کر بھاگ نکلے، لیکن اب ہمیں اس زخمی اور معذور شیرنی سے کوئی خطرہ نہ تھا، کیوں کہ وہ مرنے ہی والی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ تین گولیاں کھانے کے باوجود وہ اتنی دیر تک زندہ کیسے رہی۔ میکنٹوش نے چند لمحے تک شیرنی کو غور سے دیکھا اور پھر اس پر گولیوں کی بوچھار کر دی۔

اور اس طرح چینتل درو گ، ہوس دُرگا اور ہولکرہ میں تباہی پھیلانے والی آدم خور شیرنی اپنے انجام کو پہنچ گئی جس نے نہ جانے کتنے انسانوں کو ہڑپ کیا تھا اور جن میں نوجوان اور بھولا بھالا شکاری ٹاڈ بھی شامل تھا، لیکن میں اس بات پر حیران ہوں کہ وہ دونوں الگ الگ فطرت رکھنے کے باوجود اکٹھے ہی شکار کو کیوں نکلتے تھے۔ بنگلور روانہ ہوتے وقت میں نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ شاید ایک اور آدم خور بھی جنگل میں موجود ہے اور اب کوئی واردات ہو تو فوراً مجھے اطلاع کی جائے، لیکن کئی مہینے گزر گئے اور وہاں سے کوئی خبر نہ آئی تو مجھے اطمینان ہوا۔

ہندی کہانی



تلک راج گوسوامی

دیوار پر لگے کلاک کی ٹن ٹن نے ترلوکی بابو کو چونکا دیا۔ آٹھ بج چکے تھے، دو گھنٹے میں اسے دفتر پہنچنا تھا۔ وہ صبح چار بجے سے دس بارہ صفحات کے ایک لمبے چوڑے اسٹیٹمنٹ سے ماتھا پچی کر رہا تھا۔ لاکھ کوشش کرنے پر بھی اس کے ٹوٹل نہیں مل رہے تھے۔ رہ رہ کر اس کی آنکھوں کے سامنے فرم کے بوڑھے گنجے منیجر کھنّا چاریہ کی غضبناک صورت گھوم رہی تھی۔ سوچ رہا تھا یہ کتنا نیچ ہے، کسی کے پیٹ میں لات مارتے اس کمینے کو ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ ابھی پرسوں ہی تو بنا کسی خاص وجہ کے گپتا بابو کو معطل کر دیا تھا۔ منیجر کے الفاظ اب بھی اس کے کانوں کو چھید جا رہے تھے۔ "تم لوگ کام میں کوئی انٹریسٹ نہیں لیتا۔ حرام کی کھاتا ہے، اگر کل تک یہ اسٹیٹمنٹ پورا نہ ہوا تو ہم ہیڈ آفس کو رپورٹ کر دے گا، تمھارا نوکری جاتا رہے گا۔" ترلوکی پریشان تھا، اگر اس کی نوکری جاتی رہی تو کیا ہوگا۔ گھر میں گذر کیسے ہوگی۔ گاؤں میں رہنے والے بوڑھے ماں باپ کا کیا ہوگا۔ چھوٹی بہن کے ہاتھ کیسے پیلے ہوں گے؟

بغل والے کمرے میں ترلوکی کی بیوی شیلا چولھا پھونک رہی تھی۔ کمرہ دھوئیں سے بھرا پڑا تھا۔ چار برس کے پنٹو اور دو برس کی بے بی نے چلاّ چلاّ کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ شیلا دانت پیس پیس کر ہاتھ میں لوہے کی پھونکنی لئے

ان دونوں کو ڈانٹ پھٹکار رہی تھی۔ کبھی اپنے روکھے سوکھے پریشان بالوں کو ہاتھ سے ٹھیک کرنے کی ناکام کوشش کرتی اور کبھی اپنی قسمت کو کوستی۔ ترلوکی بابو اپنے دفتر کی ذہنی پریشانیوں کے علاوہ گھر کے اس ماحول سے بھی کھسیا رہا تھا۔

اتنے میں اس کے مکان کے سامنے ایک سکوٹر آکر رکا۔ ترلوکی نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ کیپٹن کھنہ کا اپنی بیوی رما کو ساتھ لئے ہوئے اس موقعہ پر آٹپکنا اسے کھل گیا لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ ترلوکی اپنے کاغذات سمیٹ رہا تھا اور کیپٹن کھنہ ہونٹوں میں پائپ دبائے دیواروں پر لگے دو چار برس پرانے کیلینڈر دیکھ رہا تھا۔ رما مکان میں داخل ہوتے ہی سیدھی شیلا کے پاس کچن میں چلی گئی۔ رما آج اپنی بھڑکیلی پوشاک میں خوب کھل رہی تھی۔ اس کے تراشے ہوئے خوبصورت بالوں کی لٹیں بار بار اس کے گورے چٹے چہرے پر رقص کر رہی تھیں۔ رسیلے چکنے ہونٹوں پر لپ سٹک کی ایک ہلکی سی تہہ نے ایک عجیب قسم کا نکھار سا پیدا کر رکھا تھا۔ سفید کریپ کے سلیولیس بلاؤز میں اس کا حسن چھلک رہا تھا۔ ڈیکران کی سفید ساڑی کا پلّو بار بار اس کے کندھے سے نیچے سرکتا اور وہ بڑے انداز سے اسے سنبھالتی۔

رما، شیلا کی بچپن کی سہیلی تھی۔ دونوں ایک ساتھ پانچ چھ برس تک ایک ہی کالج میں پڑھی تھیں۔ رما کو پڑھائی سے زیادہ سنیما، ناچ، نئے نئے فیشن، کالج میں ہونے والے کھیل تماشوں میں خاص دلچسپی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دو بار فیل ہو کر بھی وہ انٹر پاس نہ کر سکی جبکہ شیلا نے سکنڈ ڈویژن میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ لیکن قسمت کی بات، رما کی شادی فوج کے ایک کیپٹن سے ہوئی جب کہ شیلا کی ایک پرائیویٹ فرم کے کلرک سے۔

اور پھر رما کہہ رہی تھی۔ "شیل، تم نے اپنی کیا صورت بنا رکھی ہے۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ تم تو آدھی بھی نہیں رہ گئی۔ کیا آج کل بہت بچت ہو رہی ہے۔"

"نہیں رما، ایسی تو کوئی بات نہیں، یہاں کس چیز کی کمی ہے بھگوان نے سب کچھ دے رکھا ہے پھر میں تو اپنے آپ کو کمزور محسوس نہیں کرتی۔"

شیلا نے دل میں کمتری محسوس کرتے ہوئے جواب دیا۔ اتنے میں ترلوکی بابو کی آواز آئی۔ "بھئی اِن لوگوں کے لئے کچھ ناشتہ پانی لاؤ۔" رما فوراً بولی۔ "نہیں جیجا جی شیل کو تکلیف مت دیجئے، ابھی ابھی تو ہم لوگ بریک فاسٹ کر کے ہی آ رہے ہیں۔ مسز سکسینہ نے لنچ پر بلایا ہے انھیں کے ہاں جا رہے تھے کہ سوچا راستے میں شیل کو بھی ایک دو منٹ دیکھتی چلوں۔ اچھا اب ہمیں اجازت دیجئے۔ وہ لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔" ترلوکی بابو کو دفتر جانے کی جلدی تھی، اس نے رکنے کے لئے زیادہ نہیں کہا۔ کھنہ نے اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور رما بڑے انداز سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ شیلا نے حسرت بھری نگاہوں سے رما کی نیم عریاں پیٹھ اور باب کٹ گیسوؤں کو ہوا میں لہراتے دیکھا۔

ساڑھے نو بج چکے تھے۔ ترلوکی جلدی جلدی کھانا نگل رہا تھا۔ اتنے میں شیلا بڑبڑانے لگی۔ "دوسروں کے سامنے اس طرح پھٹے حال رہنے میں کتنا برا لگتا ہے۔ رما کیا سوچتی ہوگی، تم کو کئی مرتبہ ایک دو ساڑی لانے کے لئے کہا لیکن تمھیں میری کیا پرواہ۔ ماں باپ کے گھر تھی تو دن میں تین تین بار پوشاک بدلتی تھی لیکن یہاں . . . . ."

ترلوکی ایک دم بھڑک اٹھا۔ "تمھیں کئی بار کہا ہے کھانا کھاتے وقت اس قسم کی بکواس نہ کیا کرو۔ جاہلوں نے میرے گلے باندھ دی ہے . . . ."

"خبردار اگر اُن کو بُرا بھلا کہا۔ کسی کی بے عزتی کرتے آپ کو شرم نہیں آتی۔" شیلا تنکی۔

ترلوکی آپے سے باہر ہوا۔ دانت پیستے ہوئے اُس نے ایک چپت جما دی، کھانے کی تھال میز پر پٹک دی اور ماتھا پیٹ کر رہ گیا۔ پنٹو اور بے بی سسکنے لگے۔ ترلوکی نے سائیکل پر پاؤں رکھا اور دفتر کو چل دیا۔

پسینے میں تر بتر وہ دفتر پہنچا۔ اپنے کمرے میں گیا تو منیجر کا چپراسی پہلے سے کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ چپراسی نے کہا۔ "بڑے بابو آج آپ نے بہت دیر کر دی۔ صاحب دو مرتبہ یاد کر چکے ہیں۔" رومال سے پسینہ پونچھتے اور بغل میں اسٹیٹمنٹ دبائے اُس نے صاحب کے کمرے کا پردہ ہٹایا۔

صاحب ترلوکی کی صورت دیکھتے ہی گرج اٹھا۔ "یہ دفتر آنے کا وقت ہے،
لوگ نوکری کی پرواہ نہیں کرتا۔ کیوں دیر سے آیا؟"
ترلوکی نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "سر ایک گیسٹ آگیا تھا۔"
"نو سلی ٹاک۔ اسٹیٹمنٹ تیار ہو گیا؟"
"یس سر ایک دو پیج باقی ہے۔ ابھی ایبسٹریکٹ بھی تیار کرنا ہے۔"
"ابھی تیار کرنا ہے؟ تم لوگ کچھ نہیں کرتا، بیکار گدھے کی مافق پڑا رہتا ہے۔
ابھی کمپلیٹ کرو، آج ہی ہیڈ آفس کو بھیجنا بہت ضروری ہے۔"
ترلوکی منہ لٹکائے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ فرم کے دیگر ملازم سمجھ گئے
میں ضرور کچھ کالا ہے۔ دو گھنٹے تک دو دو چار چار چار آٹھ کرنے کے
س نے اسٹیٹمنٹ کو ٹائپ کرنا شروع کیا۔ تیزی سے اس کی انگلیاں
رائٹر پر اچھل رہی تھیں۔ مینیجر کی غضبناک صورت۔ شیلا کی گال پر پڑا
کا نشان، پنٹو اور بے بی کے سسکنے کا منظر بار بار اس کی آنکھوں کے
گھوم رہے تھے۔

گھر پر بے بی سو چکی تھی۔ پنٹو گلی میں بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ شیلا
پر پڑی اپنے نصیب کو کوس رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آج سے چھ سات
لے جب وہ اس گھر میں آئی تھی وہ کتنی خوش تھی۔ گھر کی ہر شے اُسے
ہوئی نظر آتی تھی۔ ترلوکی چوبیسوں گھنٹے لٹو کی طرح اس کے گرد گھومتا
وہ اس کے لئے اچھے اچھے کپڑے وطرح طرح سے آرائش کے
اکر کتنا خوش ہوتا تھا۔ صبح شام گھومنا، ہوٹل جانا، سینما دیکھنا یہ سب
و گیا۔ اب وہ کیوں اتنا بدل گیا ہے۔ دن رات ڈانٹ پھٹکار گالی گلوج
بات ہی نہیں کرتا۔ آخر اس نے مجھے سمجھ ہی کیا رکھا ہے۔ میں دودھ
ں ہوں، اپنا بھلا برا خوب سمجھتی ہوں۔ بیوی ہونے کا یہ مطلب تو نہیں
سردں کو پتھر سمجھے۔ دفتر میں کام زیادہ رہتا ہے، افسر ڈانٹتا ہے
میرا کیا قصور۔ آخر میرے بھی کچھ حقوق ہیں۔ پڑھی لکھی ہوں۔
ہوں۔ اپنے حقوق کو خوب سمجھتی ہوں۔ میرے ماں باپ کوئی بھوکے

ننگے نہیں۔ مجھے کھلانے کے لئے ان کے پاس بہت ہے۔ میں کہیں بھی کسی اسکول وغیرہ میں نوکری کر کے اپنا اچھی طرح آزادی سے گذارہ کر سکتی ہوں۔ میں کل ہی بچوں کو لے کر دوپہر کی گاڑی سے اپنے مائیکے چلی جاؤں گی۔

رات کے آٹھ بجے ترلوکی گھر لوٹا تب تک بے بی سو چکی تھی۔ پنٹو شیلا کے پاس بیٹھا کھسر پھسر کر رہا تھا۔ ترلوکی نے کسی کے ساتھ کوئی بات نہیں کی، چپ چاپ چارپائی پر پڑا سگریٹ کے گہرے کشوں سے غم غلط کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد پنٹو کھانے کی تھال لے کر اس کے پاس آیا۔ چاول کے پانچ سات لقمے کھا کر وہ لیٹ گیا۔ آج اُس کا دل بھاری تھا۔ جسم کی رگ رگ میں اُسے درد محسوس ہو رہا تھا۔ صبح شیلا کے ساتھ کئے گئے سلوک کے لئے اُسے رنج ہو رہا تھا۔ لیکن غلطی تو شیلا کی تھی، وہ کیوں موقع بے موقع اناپ شناپ بکنے لگتی ہے۔ خیالات کی اسی اُدھیڑ بن میں نہ معلوم کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

کمرے کے بغلی برآمدے میں اپنے خیالات میں غرق چارپائی پر پڑی شیلا کروٹیں بدل رہی تھی، وہ سوچ رہی تھی کہ شاید آج کی رات اس گھر میں اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔ کل دوپہر کی گاڑی سے ہی تو وہ اس جہنم سے دور چلی جائے گی۔ دلی، جہاں وہ آزاد ہوگی، جہاں اسے کوئی روکنے اور ڈانٹنے پھٹکارنے والا نہ ہوگا۔

"شیل تم نے اپنی کیا صورت بنا رکھی ہے؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ تم تو آدھی بھی نہیں رہ گئی۔" رما کے یہ الفاظ اسے بار بار نوچ رہے تھے شادی کے بعد رما کتنی کھِل چکی ہے، کتنی مزے کی زندگی ہے اس کی۔ نہ کھانے کی فکر نہ پہننے کی کمی۔ ایک دم گُپّا ہو رہی ہے۔ کیپٹن کھنہ تو جان دیتے ہیں اس پر لیکن اس کے برعکس میری زندگی، اُف۔۔۔!

آج کی رات کاٹے نہیں کٹ رہی تھی۔ بارہ، ایک، دو بج گئے لیکن شیلا کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی پھر بغل والے کمرے سے شوہر کے بڑبڑانے کی آواز سنائی پڑنے لگی: "شیل تم تو ایسی باتیں کر رہی ہو جیسے تم مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑے جا رہی ہو۔ تم مجھ سے دور نہیں رہ سکتی

تم ہر وقت میرے پاس ہو شیل ۔ شیل تمہاری صحت کمزور ہے ۔ وہاں جا کر لاپرواہی نہ کرنا ۔ ایک ضروری بات ۔ دلی پہنچتے ہی مجھے تار دینا ۔ پچھلی مرتبہ جب تم گئی تھیں تو مجھے تمہارے وہاں پہنچنے کی خبر کے لئے بہت انتظار کرنا پڑا ۔ پنٹو اور بے بی کا خیال رکھنا ۔ ۔ ۔ ۔ کیا کہا ؟ تم بیکار میں میری فکر کرتی ہو ۔ کچھ ہی دنوں کی تو بات ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اور تب ہی شیلا کو یاد آیا کہ ترلوکی کو بخار میں بڑبڑانے کی عادت ہے ۔ وہ کمرے میں گئی ۔ صفر واٹ بلب کی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ پنٹو اپنے ڈیڈی کے ساتھ چپک کر سو رہا ہے ۔ اس نے آہستہ سے ترلوکی کے ماتھے پر ہاتھ رکھا ۔ بخار سے اس کا جسم جل رہا تھا ۔ ترلوکی کے بولے ہوئے الفاظ اور اس کی بخار کی اس حالت نے شیلا کے دل میں ہل چل سی مچادی ۔ شفقت ، ہمدردی ، ماتا اور فرض کے پاک جذبات کے چشمے پھوٹنے لگے ۔ اس کے دل میں سوئی ہوئی عورت جاگ اٹھی ۔ وہ سوچنے لگی ، اسے کوئی حق نہیں کہ وہ پنٹو اور بے بی کو باپ کی شفقت سے محروم کرے ۔ کچھ لمحے پیشتر اس کے دل میں پیدا ہونے والی بغاوت سے اسے نفرت ہونے لگی ۔ اس کو یاد آیا کہ انسان وہ ہے جو دوسروں کے لئے جیئے ۔ اپنے لئے تو سبھی جیتے ہیں ۔ عورت کے لئے حقیقی سُکھ اور سکون اپنے آپ کو شوہر کے قدموں پر رکھ دینے میں ہی ہے ۔ شادی پیشتر ملک کے کئی رسائل اور اخبارات میں عورت کی عظمت کے متعلق لکھے اس کے اپنے مضامین کی سطور اس کے دماغ میں ابھرنے لگیں ۔ جذبات سے مغلوب ہو کر وہ اٹھی اور اپنا ماتھا شوہر کے قدموں پر رکھ دیا ۔ نیند سے بھاری آنکھوں سے آنسوؤں کے کچھ قطرے اس کے رخساروں پر لکیریں بناتے ہوئے ترلوکی کے پیروں پر لڑھک آئے ۔ وہ چونکا ، نظر شیلا پر گئی ۔ میری شیل کہہ کر اس نے اسے کھینچ کر اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا ۔

ھندی سے ترجمہ

سیر و سیاحت

زبیدہ کا مقبرہ

ضمیر کاظمی

مشرق وسطیٰ کی سیاحت کے دوران میں یوں تو مجھے بہت سی عالیشان عمارات کے دیکھنے کا موقع ملا۔ لیکن اُن میں سب سے زیادہ جاذب نظر ملکہ زبیدہ کا مقبرہ ہے۔ عراق کے دارالحکومت بغداد کی سیر کرتا ہوا ایک دن میں شہر سے کافی دور نکل گیا اچانک میری نگاہ ایک بہت قدیم و ویران قبرستان میں ایستادہ ایک مقبرہ پر پڑی۔ جب میں اس سادہ لیکن دلآ ویز مقبرہ کے پاس پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی کہ یہ ہندوستانی فن تعمیر کا زندہ جاوید نمونہ ہے۔ سب سے پہلے میرے دل میں یہ جاننے کی خواہش ہوئی پیدا ہوئی کہ یہ کس کی آخری آرام گاہ ہے۔ نیز ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اس کو ہندوستانی آرٹ سے متاثر ہو کر کس نے تعمیر کرایا۔ تحقیق کرنے پر محض یہ معلوم ہو سکا کہ مشہور خلیفہ ہارون رشید کی زوجہ ملکہ زبیدہ مٹی اور چونے کے اس ڈھیر کے پیچھے محو خواب ہے۔ لیکن میرے دوسرے سوال کا جواب کوئی نہ دے سکا۔ اور شش و پنج میں اپنے ذہن میں تاریخ عرب اور اوراق پارینہ پلٹتا ہوا میں ہوٹل واپس آگیا۔ بہت کچھ غور و خوض کرنے کے بعد آخر اس سوال کا جواب بھی مل گیا۔

ملکہ زبیدہ تاریخ عرب کے عہد زریں ۷۸۵ء میں پیدا ہوئیں ان کے شوہر ہارون رشید (جن کا نام ہم دنیا کی مشہور معروف کتاب الف لیلہ کی کہانیوں میں سنتے ہیں۔) کا دربار اس عہد کا بہت عظیم الشان دربار تھا...... جس میں دنیا کے ہر گوشہ سے عالم اور ماہرین کھنچ کھنچ کر آتے تھے اور ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے۔ خلیفہ ہارون رشید کا لائق اور فرزانہ فرزند مامون علوم و فنون کی سرپرستی میں اپنے والد پر بھی سبقت لے گیا۔ خلیفہ تمام

کا دربار مختلف رنگ و نسل کے عقلا شعرا، اور ادبا سے بھرا رہتا تھا۔ دیوبان نامی سنسکرت کا ایک زبردست عالم اُس کے دربار کا ایک انمول رتن تھا۔ اس کے علاوہ متعدد ہندوستانی طبیب، حساب داں، مہندسین و دیگر ماہرین فن سے بھی اس کا دربار آراستہ تھا۔ اُس وقت حکومت عرب ہر شعبہ میں پایۂ عروج پر تھی۔

ملکہ زبیدہ خود بھی ایک قابل خاتون اور شہرت یافتہ شاعرہ تھی ۷۹۲ء کا ایک عجیب واقعہ اُس کی ادبی قابلیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ ایک دن جب کہ ہارون رشید دربار میں رونق افروز تھے کہ انھیں اپنے ہمعصر بائیزنطین کے شہنشاہ نائیٹ فورس کا ایک اہانت آمیز مراسلہ ملا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ اُس نے صلح توڑکر خلیفہ کے بہت سے شہروں کو تباہ و برباد کردیا ہے۔ اس کا خط پڑھتے ہی ہارون رشید آگ بگولا ہوگیا۔ ادھر شدت غیظ کے سبب اس پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اُس کے مصاحبین خوف کے باعث یکے بعد دیگرے منتشر ہوگئے یہاں تک کہ اُن کے وزیر اعظم بھی اُن کو کسی قسم کا مشورہ دینے کی ہمت نہ کرسکے۔ آخر کار زبیدہ نے خلیفہ کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور فی البدیہہ ایک نظم کہی جس کا ماحصل یہ تھا کہ خدا کبھی دھوکا بازوں اور ظالموں کو معاف نہیں کرتا تو جلد ہی اپنے گستاخانہ خط کا جواب سنے گا۔ نہیں! بلکہ آنکھوں سے دیکھے گا۔ اور خلیفہ کو یہ رائے دی کہ یہ نظم نائے فورس کے پاس بھیج دی جائے۔ اس جامع اور مانع نظم نے خلیفہ کی ہیجانی کیفیت دور کردی۔ اور دوسرے ہی دن ہارون رشید ایک عظیم الشان لشکر کے ساتھ نائے فورس کو اس نظم کا مطلب سمجھانے کے لئے روانہ ہوگیا۔

ملکہ زبیدہ نے عربی تہذیب پر اپنا نقش چھوڑا ہے۔ اُنھوں نے عورتوں کے لئے ایک بہت خوبصورت لباس رائج کیا "ہوادار (وہ کرسی جسے چار آدمی کاندھے پر لے کر چلتے ہیں) کو مروج کرنے کا سہرا بھی زبیدہ ہی کے سر ہے۔ ایک مرتبہ وہ حج کرنے مکہ معظمہ تشریف لے گئیں وہاں پانی کی قلت کی وجہ سے لوگوں کی تکلیف دیکھ کر اُن کو بہت رنج ہوا اور اُنھوں نے فوراً تین کروڑ کے صرفہ سے ایک بہت بڑی نہر تعمیر کرائی جو اب بھی نہر زبیدہ کے مشہور ہے۔ یہ نہر عراق سے نکالی گئی تھی اور مکہ تک اُس کی لمبائی ایک ہزار میل تھی اس کے آثار آج بھی موجود ہیں لیکن موجودہ نہر زبیدہ کا منبع مکہ کی پہاڑیاں ہیں۔

زبیدہ کا مقبرہ مامون کے عہد حکومت کسی ماہر تعمیرات کی زیر نگرانی تعمیر کیا گیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستانی فن تعمیر سے متاثر اور مزین ہے اس کے زمانے میں اور بھی کچھ عمارتیں ضرور ہندوستانی طرز پر بنوائی گئی ہوں گی لیکن افسوس کہ اب اُن کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ کیونکہ سنہ ۱۳۶۸ء میں ظالم اور سنگدل ہلاکو خاں کی منگول فوجوں کے ہاتھوں بغداد کے شاندار سنگ مرمر کے محلات، درسگاہ اور دنیا کے جملہ علوم و فنون پر لکھی ہوئی کتابوں سے بھرپور دارالمطالعے نیست و نابود ہو گئے۔ لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جس طوفانی حملے نے بغداد کی شان و شوکت کو مٹی کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا تھا اُس کی زد سے یہ مقبرہ کیسے بچ گیا۔

نادر و نایاب نسخے

روغن برق رجسٹرڈ



گھر کا ڈاکٹر

ہر قسم کے درد۔ چوٹ۔ موچ۔ ورم۔ زخم۔ دردِ سر۔ دردِ چشم
اعصابی تکالیف۔ بچھو بھڑ کے ڈنک۔ دردِ کمر۔ خنّاق
میٹھوا۔ دردِ کان دردِ دانت۔ دردِ پسلی۔ سوکھا روگ
نزلہ۔ زکام۔ گھٹنوں کا درد۔ ورم طحال۔ دردِ گردہ۔ دردِ سینہ۔ اعصابی کمزوری
نمونیہ۔ سبنے اعصاب کٹنے کے لئے بہت مجرب اور زود اثر ثابت ہوا ہے۔

قیمت فی شیشی ۴۰ پیسہ، ۸۰ پیسہ، ایک روپیہ ۶۰ پیسہ، دو روپیہ ۵۰ پیسہ

یونین کیمیکل ورکس کی کامیاب ایجاد

روغن سملبائی

پرُانے اور آدھے سر کے درد اور ایسے دردِ سر کے لئے جو سورج کے بڑھنے اور گھٹنے کے ساتھ بڑھتا اور گھٹتا ہو اور آنکھوں کے ڈھیلوں میں شدّت کا درد ہو، حد درجہ مفید ہے۔

ہزاروں لاکھوں اشخاص نے اس خداداد نعمت سے شفا حاصل کی ہے۔ آپ بھی استعمال کریں اور قدرت خداوندی کا کرشمہ دیکھیں۔

قیمت فی شیشی ۹۰ پیسہ، ایک روپیہ ۵۰ پیسہ، ۲ روپیہ ۴۵ پیسہ

لاکھوں مریض شفایاب ہوچکے ہیں

قمرالدین بدرالدین پرفیومرس
چوک الہ آباد ۳

اس حسین مسکراہٹ
کا
راز



سائنٹیفک طریقے سے بنایا ہوا۔

بھارت
دنت منجن

- دانتوں کو زیادہ سفید اور چمکدار بنانے کے لئے
- مسوڑوں کی حفاظت کے لئے
- سانس کی بدبو کو ختم کرنے کے لئے
- دانتوں کی سڑن کو روکنے کے لئے
- دانتوں کی اور بھی دوسری تکلیفوں کو دور کرنے کے لئے



ہمیشہ بھارت دنت منجن ہی استعمال کریں

تیار کردہ

بھارت کیمیکل ورکس

الٰہ آباد

Collection of Shobhit Mahajan. Courtesy Sarai.

۱۸۸۷ء سے

مشہور

قابلِ اعتماد

اور

ممتاز دواخانہ

شودھی چھوٹی ہرّیں
پیٹ کی جملہ شکایت کے لئے!

عرق انگور مُرکّب
دِماغی و جسمانی کمزوریوں کے لئے!

بال امرت گھُٹّی
دودھ پیتے بچوں کے دودھ ہضم کرنے کے لئے!

کرشن کا بال امرت
بچوّں کی میٹھی پُشٹی!

لال تیل
بچوّں کے سوکھا و مٹھوا روگوں میں ملنے کے لئے!

جہاں تمام دوائیں اعلیٰ قسم کی تر و تازہ اور خالص جڑی بوٹیوں سے تیاّر کی جاتی ہیں جنھیں بچّے بوڑھے و جوان ہر عُمر کے لوگ بغیر کسی خوف کے پُورے اعتماد کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں آپ بھی اپنی تکلیفوں کو دور کرنے اور مکمل صحت پانے کیلئے مندرجہ ذیل پتہ سے دوائیں منگائیں اور استعمال کریں۔



اعتماد کا نشان

حکیم رام کِشن لال
یونانی مڈیکل ہال، رانی منڈی، الہ آباد

FASANA (URDU MONTHLY) VOL. II—IV|67
ALLAHABAD. Price Rs. 1/- Regd. No. L—420
Registered with the Rgistrar of Newspaers for India at No. 9775/64

